باسمہ تعالیٰ

مضامین مجرّب

مصنّفہ

ڈاکٹر سید احمد میرزا مجرّب

اسسٹینٹ پروفیسر شعبۂ اردو شیعہ پی۔جی۔کالج لکھنؤ

Mob. 9389946118

ناشر

ادارۂ اصلاح

مسجد دیوان ناصر علی مرتضیٰ حسین روڈ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۳ (انڈیا)

مشخصات

نام کتاب	:	مضامین مجرّب
مصنّفہ	:	ڈاکٹر سید احمد میرزا مجرّب
کمپوزنگ	:	ممتاز
کور ڈیزائننگ	:	مہدی باقری
صفحات	:	64
سنہ اشاعت	:	اگست ٢٠١٨ء
مطبوعہ	:	امپریشن آفسیٹ پریس لکھنؤ
ناشر	:	ادارۂ اصلاح، لکھنؤ
قیمت	:	پچاس روپئے (-/50)

ISBN13: 978-93-87479-11-1

ISBN10: 93-87479-11-02

ادارۂ اصلاح

مسجد دیوان ناصر علی مرتضیٰ حسین روڈ لکھنؤ۔ ٢٢٦٠٠٣ (انڈیا)

فون و فیکس نمبر: 0091 522 4077872

E-mail:islah_lucknow@yahoo.co.in

www.islah.in

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

الحمد لاھلہ والصلوٰۃ علیٰ اھلھا

خاندان عشقؔ و تعشقؔ کے چشم و چراغ مؤلف مہذب اللغات سید محمد میرزا مہذب لکھنوی ممتاز الافاضل کے فرزند اصغر جناب ڈاکٹر سید احمد میرزا مجربؔ لکھنوی پیشہ سے استاذ، فن میں مرثیہ خواں ہیں لیکن وہ بہترین مضامین نگار بھی ہیں اس کا علم کم لوگوں کو ہے۔ ان کے والد مرحوم گفتگو میں باغ و بہار تھے تو یہ اپنی شگفتہ تحریر میں امتیازی حیثیت رکھنے والے ہیں۔ ادارۂ اصلاح لکھنؤ نے ان کے مجموعۂ مضامین کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ناظرین جب اس مجموعہ کا مطالعہ فرمائیں گے تو یقیناً جناب مجربؔ لکھنوی کے قدردانوں میں اضافہ ہوگا۔

فقط

سید محمد جابر جوراسی

مسئول ادارۂ اصلاح لکھنؤ

۱۵ اگست ۲۰۱۸ء

سید صاحب تعشقؔ کی غزل گوئی اور خوش گوئی میں امتیازی حیثیت

والد مرحوم مہذب لکھنوی نے قدیم دور کے ایک مشاعرے کا ذکر فرمایا تھا جسے میں نے قلمبند کیا۔ ''ایک زمانہ تھا کہ لکھنؤ اور لکھنو کے مشاعرے تہذیب و اخلاق کا نمونہ تھے اور لکھنؤ مرکز زبان و ادب تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ اگر کوئی شخص مشاعرے میں لحن کے ساتھ کوئی شعر پڑھ دیتا تو پورا مشاعرہ اٹھ کر چلا جاتا۔

زیادہ تر دوزانو تخت پہ بیٹھ کر غزل پڑھی جاتی۔ پڑھنے والے کے سامنے وہ لالہ جس میں شمع روشن ہوتی تھی بڑھا دیا جاتا تھا۔ پورے مشاعرے میں نہایت سادگی کے ساتھ غزلیں پڑھی جاتی تھی۔ جناب حکیم منے آغا صاحب آفتاب نے جو میرے والد مرحوم سے ملنے آتے تھے ان سے بیان فرمایا تھا کہ لکھنؤ میں حضرت تعشقؔ کے عہد میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اور جو دعوت نامے تقسیم ہوئے اس میں مصرع طرح کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ منزل اور قاتل قوافی کے ساتھ ''دل'' کا قافیہ ضرور کہا جائے۔ جب شہر میں دعوت نامے تقسیم ہوئے اور دال منڈی رکاب گنج میں حضرت عشقؔ و تعشقؔ تک یہ خبر پہونچی تو یہ بات پڑھ کر سب کو کھل گیا۔ محمد میرزا انس نے فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا امتحان لیا جا رہا ہے۔ چنانچہ تمام خاندان والوں کو حکم دے دیا کہ جہاں اور غزل کے اشعار کہو وہاں دل کے قافیے زیادہ سے زیادہ کہو۔ کسی نے سو شعر کہے تو کسی نے اسّی۔ پیارے صاحب رشیدؔ نے ساٹھ شعر کہے۔

حضرت تعشقؔ نے بھی غزل کہی اور دل کے قافیے کا ایک شعر کہا۔ حضرت انسؔ نے سب کے شعروں کو سن کے حضرت تعشقؔ سے کہا کہ مشاعرے میں صرف تمہیں جانا اور کوئی نہ جائے۔ چنانچہ مشاعرے میں صرف سید صاحب تعشقؔ گئے۔ مشاعرہ شروع ہوا اور ہر ایک نے اور قوافی کے ساتھ دل کا قافیہ بھی کہا چھپتیں اڑنے لگیں اور واہ واہ کا زور رہا اور ہر ''دل'' کا قافیہ سننے کے بعد ہر شخص اپنی جگہ یہ سوچتا تھا کہ اس سے بہتر دوسرا شعر نہیں ہوسکتا بس یہی شعر حاصل طرح ہے۔ پوری رات ''دل'' کے قافیے چلتے رہے، صبح ہوتے تعشقؔ کی باری آئی۔ اب صرف دو تین بزرگ اور حضرت آتشؔ پڑھنے کو باقی رہ گئے تھے۔ یہ آتشؔ کا وہ دور تھا کہ ضعیفی کی وجہ سے کمزور ہو چلے تھے بڑی دقت سے مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔

یہاں تک کہ تعشقؔ کی باری آئی اور غزل شروع کی۔ چونکہ تعشقؔ کی خوش گوئی مشہور زمانہ ہو چکی تھی، اس لئے مشاعرے کو بھی انتظار تھا کہ یہ دل کا قافیہ پڑھیں گے۔ سید صاحب تعشقؔ نے چند شعر پڑھنے کے بعد اہل مشاعرہ سے کہا کہ میں نے بھی دل کا قافیہ کہا ہے اور یہ کہہ کے شعر پڑھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے دل کے اشعار اس وقت تک پڑھے گئے تھے ان سب کو اہل مشاعرہ بھول گئے اور سید صاحب تعشقؔ پر مشاعرہ ختم ہوا۔

اور حضرت آتشؔ مرحوم جو ضعیفی کی وجہ سے گاؤ سے لگے بیٹھے تھے کہنیوں پر زور دیتے ہوئے سیدھے ہوئے اور بلند آواز سے فرمایا کہ میاں ''خدا تمہیں زندہ وسلامت رکھے ہم تو چراغ سحری ہیں اب خوش گوئی کا سہرا تمہارے سر رہے گا۔''

دو تین بزرگ شعراء اور حضرت آتشؔ ابھی مشاعرہ پڑھنے کو باقی رہ گئے تھے لیکن انہوں نے غزلیں نہیں پڑھیں۔

وہ حضرت تعشقؔ کا شعر یہ تھا۔

برق رہ رہ کے چمکتی ہے تو میں کہتا ہوں ہو غنیمت اگر اتنا بھی مرا دل ٹھہرے

اس شعر کی لکھنو میں دھوم ہو گئی۔

تعشق کی غزل گوئی اور امتیازی خصوصیت کا اظہار کرتے ہوئے دیوان تعشق کے ایک قلمی نسخے میں اپنی رائے کا اظہار جعفر علی خاں صاحب اثرؔ نے یوں کیا ہے۔

''تعشق مرحوم کی یہ غزل، آرزو تیری، جستجو تیری بڑے معرکہ کی ہے۔ اسی زمین میں آتشؔ کی بھی غزل ہے جس کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں قسم ہے قرآں کی جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

تعشقؔ نے بھی یہ قافیہ کیا خوب کہا ہے بلکہ آتش کے شعر سے زیادہ مؤثر ہے۔

پڑھا جو نزع میں قرآں رہی نہ جسم میں روح زبان بند ہوئی سن کے گفتگو تیری

میرزا محمد بشیر نے جب ''کلام تعشق'' شائع کیا جو ان سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ دیوان میں ایک شعر کا موازنہ آتش سے کیا ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش کا شعر بجنسہ اسی مضمون کا ہے۔

سنا ہے ہم نے بھی قرآں قسم ہے قرآں کی جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

زبان کے اعتبار سے دونوں شعر خوب ہیں۔ لیکن مضمون کے خیال سے آتشؔ کے یہاں صرف تعریف ہے۔ اور تعشقؔ کے یہاں تعریف کے ساتھ ایک واقعہ بھی ہے جس میں جدت پیدا ہو گئی ہے۔

صحت زبان میں اوروں کے مقابل سید صاحب تعشقؔ کا مقام:

سید صاحب تعشقؔ زبان و بیان کے لحاظ سے دوسروں سے زیادہ امتیازی حیثیت رکھتے تھے، بازاری زبان کو اپنے کلام میں بالکل جگہ نہیں دی۔ خاندان تعشقؔ نے زبان و ادب پر بہت بڑا احسان کیا ہے جو قیامت تک نہیں بھلایا جا سکتا بالخصوص تعشقؔ جن کی غزلوں نے بتا دیا کہ لکھنؤ کی غزل گوئی پر جو اعتراضات ہیں۔ مثلاً کنگھی، چوٹی، مسی، سرمہ اور بازاری خیالات یہ بالکل بے حقیقت ہیں۔ سید صاحب تعشقؔ کی غزلیں ان تمام چیزوں سے بالکل مبرّ او معرّا ہیں۔

ان چیزوں کو نظم میں لانا تہذیب و اخلاق کے نزدیک جائز نہیں۔ دہلی اور لکھنو کے شعراء نے ایسے رکیک الفاظ اور فحش خیالات کا استعمال کیا ہے مثلاً آتش کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہوتا ہے خوش نوائی بلبل سے آشکار　　　یہ مشت پر بھی شاعروں کا احتلام ہے

تعشقؔ نے اپنے کلام میں لفظ نطفہ، یا لفظ احتلام سے پرہیز کیا ہے اس کے برعکس ان الفاظ کا استعمال کیا ہے کہ جو دائرہ تہذیب میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شعر امیر مینائی کا دیکھیں اتنے کہنہ مشق شاعر نے کچھ عجیب اوچھے انداز میں محبوب کے سینے کی تعریف کی ہے یہ شعر تہذیب و اخلاق کے منافی ہے۔

چہرہ دکھلایا ہے جو بن بھی دکھاؤ صاحب　　　وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

(امیر مینائی)

لیکن اس کے برعکس تعشقؔ نے محبوب کے حسن اور اس کے شباب کا ذکر کیا خوبی سے کیا ہے اور کن لطیف اشاروں سے کام لیتے ہوئے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا انصاف صاحبان نظر کریں:

گر پڑے آنسو عروج ماہ کامل دیکھ کر　　　میری نظروں میں ترا عہد جوانی پھر گیا

(تعشقؔ)

حق و انصاف کی بات یہ ہے کہ ایک دوسری جگہ آتشؔ نے بہت خوبی وحسن سے محبوب کے سینے کا ذکر کیا ہے واقعی قابل تعریف شعر ہے۔ یہاں ایک بات اور کہتا چلوں کہ اس شعر میں لفظ ''آب رواں'' پر اس دور کے اساتذہ نے اعتراض کیا تھا اور ان کی دلیل یہ تھی کہ آب رواں بظاہر تو فارسی ہے مگر کپڑے کے معنی میں اردو ہے۔

کسی کی محرمِ آب رواں کی یاد آئی　　　حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

(آتشؔ)

اب آپ مثال کے طور پر داغؔ دہلوی کا شعر ملاحظہ فرمائیں کہ کس پست خیالی کا ثبوت دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سنجیدہ دنیائے شاعری تو ان کو برداشت نہیں کرے گی۔ حضرت داغؔ نے بہت کھل کے اپنی خواہش کا اظہار اس شعر میں کیا ہے۔

کہنے کو تو کیا ان سے ملاقات نہ ہوگی　　　جس بات کی خواہش ہے وہی بات نہ ہوگی

آتشؔ جیسا مسلم الثبوت خوش گو ماہر فن شاعر کہنے پر آیا تو ایسا مبتذل شعر کہہ گزرا کہ میں سمجھتا ہوں نہ اُس وقت لوگوں نے پسند کیا ہوگا نہ اِس وقت کچھ بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

تیرہ بختی کے اثر نے شام سے گل کر دیا　　　صبح کو کوّے اٹھا کر شمع تربت لے گئے

میرا یہ خیال ہے کہ تعشقؔ کا پورا دیوان بھی چھان مارا جائے تو اس قسم کے شعر نہیں ملیں گے اگر ملیں گے تو دُرِّ بے بہا مثال ذیل میں ہے:

اس قدر نایاب دنیا میں محبت ہو گئی　　　چشمۂ آب بقا چشم مروّت ہو گئی

مہذبؔ لکھنوی دور شاعری حصہ اول کے صفحہ ۳۹۹ پر تعشقؔ اور دیگر شعراء بالخصوص میر تقی میرؔ کے کلام سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''یہ کہنا کہ تلاش سے بعض اشعار تعشقؔ

کے ایسے نکل سکتے ہیں جو شعر کہے جا سکیں۔

تو بندہ نواز اب کہوں گا کہ میرؔ کے ساٹھ ہزار شعروں میں صرف بہتر نشتر نکل سکے باقی کو مہمل کہیے۔ میری تہذیب تو اس کو گوارا نہیں کرتی۔ یوں سہی میرؔ و تعشقؔ کا مقابلہ و موازنہ کر لیجئے وہاں ساٹھ ہزار میں بہتر نشتر ہیں یہاں ایک ہزار شعر بھی نہیں مگر دو نے نشتر نہ نکلیں تو آج سے شاعری چھوڑ دوں گا، تعشقؔ ایک ایسے رنگ کے مالک تھے جس کا جواب لکھنؤ اور دہلی دونوں میں ملنا ناممکن ہے۔ (دور شاعری مصنفہ مہذب لکھنوی، صفحہ ۳۹۹)

سید صاحب تعشقؔ کے تین شعر غیر مطبوعہ ہیں:

وہ پھیرے تھا منھ ذبح میں ہو رہا تھا
خدا جانے ہنستا تھا یا رو رہا تھا

شب ہجر تھی میں بدلتا تھا پہلو
زمانہ اِدھر کا اُدھر ہو رہا تھا

اِدھر دل اُدھر ڈوبتے تھے ستارے
شب وصل آخر تھی میں رو رہا تھا

سید صاحب کا ایک مطلع ہے جو اپنی معنویت کے اعتبار سے نہایت پر اثر ہے۔

دل ہے مردہ خلد میں جانے سے کیا ہو جائے گا
ہم جہاں ہوں گے وہ گھر ماتم سرا ہو جائے گا

تعشقؔ کے ہم عصر شعراء میں خواہ دہلی کے ہوں یا لکھنؤ کے ایک نمایاں خصوصیت کی حامل ان کی ذات، ان کی شاعری ہمیشہ رہی اور اس دور کے تمام شعراء نے ان کو ہر دل عزیز رکھا۔

سید محمد میرزا نام
مہذبؔ تخلص کے حالات زندگی:

ان کے حالات زندگی کی ابتداء انہیں مرحوم کے شعر سے کرتے ہیں۔

تزکرہ سے مرے دل شاد کرے گی دنیا جب نہ ہوں گا تو مجھے یاد کرے گی دنیا

(مہذبؔ)

نام سید محمد میرزا تخلص مہذبؔ، آپ کی پیدائش ۶ جنوری ۱۹۰۶ء کو امام باڑہ نیا محل منصور نگر لکھنؤ میں ہوئی۔

سلسلۂ نسب آٹھویں امام، امام رضائے غریبؑ تک پہنچتا ہے۔آپ کے جد بزرگوار سید محمد میرزا انسؔ شاگرد حضرت ناسخؔ لکھنوی تھے صاحب دیوان بھی تھے اور اپنے عہد کے مستند اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔

ان کے پانچ فرزند تھے، سید حسین میرزا عشقؔ، سید میرزا تعشقؔ، سید احمد میرزا صابرؔ، سید نواب میرزا عاشقؔ، سید عباس میرزا صبرؔ، مہذب لکھنوی کا سلسلہ انسؔ کے بڑے فرزند میر عشقؔ سے ملتا ہے ان کے فرزند سید حیدر میرزا ادبؔ اور ان کے فرزند سید عسکری میرزا مودبؔ ان کے فرزند سید محمد میرزا مہذب اور سید عابد میرزا اکرمؔ جو کراچی میں مقیم تھے اب وفات پا چکے ہیں۔

حضرت مہذبؔ کے دو فرزند سید حسین میرزا مقرب اور سید احمد میرزا مجربؔ،

حضرت مہذبؔ کے نانا سید محمد ہادی صاحب زارؔ تھے جو جناب عشقؔ کے شاگرد تھے، اور

جناب عشقؔ نے انہیں کے لئے ایک رسالہ فن شاعری پر متروکات عشق کے نام سے لکھا تھا جس کو سید مسعود حسن صاحب ادیب نے ۱۹۶۲ء کے نیا دور رسالے میں شائع کرا دیا تھا۔ چھ سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم کا سلسلہ گھر پر شروع ہوا اس کے بعد مدرسہ سلطان المدارس میں داخلہ لیا اور وہاں سے فاضل کی سند حاصل کر کے مدرسہ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی اور ۱۹۳۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل کیا۔

آغاز شاعری:

گھر کے شاعرانہ ادبی ماحول میں آنکھ کھولی خود طبیعتاً شاعر تھے اس لئے دس گیارہ سال کے سن سے شعر گوئی کی طرف طبیعت راغب ہوگئی۔ تقریباً ۱۵ر سال کی عمر میں جناب مؤدبؔ نے ایک مصرع طرح دیا کہ اس میں سلام کہو مصرع طرح یہ تھا۔

کہا حر نے سپاہ اشقیا سے

والد مرحوم نے اس طرح میں متعدد اشعار کہے طرح کے مصرع پر مصرع لگا کے مطلع کیا اور وہ مطلع یہ ہے:

عداوت ہے عبث شاہ ہدا سے
کہا حر نے سپاہ اشقیاسے

اسی سلام کے ایک شعر پر جد امجد حضرت مؤدبؔ مرحوم بہت خوش ہوئے اور بہت ہمت افزائی کی وہ شعر یہ ہے:

ہوئے یاں دفن واں کی سیر کر لی
کہ جنت متصل ہے کربلا سے

اس کے بعد اور طرحوں میں سلام، غزلیں، قصیدے، قطعہ تاریخیں کہتے رہے۔ پھر

آپ نے اپنے گھر پر ہر منگل کے دن ایک طرحی مشاعرہ کی بنا ڈالی، جس کا سلسلہ چھ سات سال تک بلا ناغہ چلتا رہا۔ اس کے بعد شہر میں اور بیرون شہر شرکت کرتے رہے۔

غزلوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ لیکن وہ سب ایک جگہ مرحوم کی زندگی میں جمع نہیں ہوسکیں۔

میں تلاش و جستجو کے بعد یکجا کر رہا ہوں اور دیوان کی شکل میں شائع کراؤں گا۔

نموناً غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

روح ٹھری رہی مرنا ہوا مشکل مجھ کو ذبح کے بعد جو دیکھا کیا قاتل مجھ کو
دزدیدہ اک نظر مرے چہرے پہ ڈال کے آنکھوں کی راہ لے گئے دل کو نکال کے
دو چار ہم غریبوں کے بس آشیاں جلائے گلشن میں بجلیاں بھی گریں دیکھ بھال کے
صیاد نے رہا نہ کیا چل بسی بہار پچھتائے ہم قفس میں نئے پر نکال کے
محفل میں شاعروں کی مہذبؔ رہو خموش نکلیں کہیں نہ باتوں میں پہلو ملال کے

بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر نے جون ۱۹۵۸ء میں ایک مشاعرہ کے سلسلے میں والد مرحوم کو کشمیر میں بلایا اور اس مشاعرے کے سلسلے میں ایک غزل کہی جس کے چند شعر پیش خدمت ہیں۔

ایک مشکل کو بدل کے دوسری مشکل سے ہم داد ہمت چاہتے ہیں صاحبان دل سے ہم
قتل گہہ میں بس ہمیں رتبہ شہادت کا ملا زیر خنجر لے گئے دادِ وفا قاتل سے ہم
آیئے جلد آیئے اب دم لبوں پر آچکا آخری آواز دیتے ہیں بڑی مشکل سے ہم
اے مہذبؔ لاکھ طوفان آئیں ہم کو خوف کیا اب تو ہمت باندھ لی اور ہٹ چکے ساحل سے ہم

مشاعرۂ کشمیر میں غزل کے ساتھ جشن بہار کشمیر کے سلسلے میں بندوں کی شکل میں نظم

کہی تھی، جس کے دو ایک بند پیش ہیں۔

غل ہے کشمیر میں جنت کی بہار آئی ہے چارسو رحمت باری کی گھٹا چھائی ہے
یہ وہ منظر ہے کہ ہر آنکھ تماشائی ہے ہر گلستاں کا حسیں محوخودآرائی ہے
نئے انداز نئی چال نئے گہنے ہیں نئی پوشاک عروسان چمن پہنے ہیں
کہہ دو صیاد ادھر رخ نہ کرے اب زنہار رات دن باغ میں آنے کی ہے کوشش بیکار
ہم کو گلزار کا خالق نے کیا ہے مختار ہم مناتے ہیں بڑی دھوم سے اب جشن بہار
خوف گلچیں کا نہیں شام وسحر شاد ہیں ہم ایک اک پھول سمجھتا ہے کہ آزاد ہیں ہم

ایک مشاعرہ حیدرآباد میں ۱۷ر جون ۱۹۴۶ء میں ہوا تھا جو یادگار حضرت ضامنؔ کے سلسلے میں تھا۔ جس کی صدارت نواب تراب یار جنگ بہادر نے کی تھی۔ اس غزل کے تین شعر پیش خدمت ہیں۔

میں نے اپنے ہاتھ سے کھودی ہے لحد دل کے لئے اب حدیں قائم ہوئی ہیں عشق کامل کے لئے
آشیاں کا ایک تنکا تک نہ چھوڑا برق نے اب بہت دشوار ہے میری رگ دل کے لئے
اے مہذبؔ چار دن کی زندگی کے واسطے چاہتا ہوں ایک درد مستقل دل کے لیئے

غزل کے ساتھ ساتھ اپنے خاندانی فن مرثیہ گوئی کو جاری وساری رکھا اور انتقال تک تقریباً ۸۵ر مرثیے کہے، بسلسلہ مرثیہ خوانی ہندوستان کے مختلف شہروں میں جاتے رہے، خصوصیت کے ساتھ پٹنہ، آگرہ، جانسٹھ، فیض آباد، الہ آباد، بنارس، شیخ پورہ حسین آباد، ممبئی، کلکتہ وغیرہ۔

حیدرآباد دکن بھی بسلسلہ ذاکری ایک عرصے تک گئے اور حد سے زیادہ کامیابی میر انیسؔ اور پیارے صاحب رشیدؔ کو ملی۔ ان کے بعد اگر کسی دوسرے کو کامیابی ملی تو وہ حضرت

مہذبؔ ہیں۔ابتداء میں اپنے پدر بزرگوار مودبؔ لکھنوی کی پیش خوانی کرتے رہے، پھر ان ہی کی زندگی میں با قاعدہ وہاں کی مجلسیں پڑھیں ،نواب بہرام الدولہ کی زندگی میں نواب خان خانہ بہادر کی ڈیوڑھی پر مجلسیں پڑھیں نواب بہرام الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند تراب یار جنگ بہادر مجالس کرتے رہے ۱۳۵۱ھ تک سفر حیدرآباد کا سلسلہ رہا، ان کے بعد سے با قاعدہ وہاں نہ کوئی مرثیہ خوان گیا نہ پھر ویسی مجلسیں ہوئیں۔

مہذبؔ لکھنوی کی چند اہم مجلسوں میں ایک مجلس وہ بھی ہے جس کی بنا آنجہانی صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے ''صوبہ بہار'' کی گورنری کے زمانہ میں پٹنہ کے گورنر ہاؤس میں منعقد کی تھی۔جس کے با قاعدہ کارڈ چھپوا کر معززین شہر میں تقسیم ہوئے اس مجلس میں خود ڈاکٹر ذاکر حسین زیر منبر تشریف فرما رہے۔آخر میں تبرک تقسیم ہوا۔

یوں تو مہذبؔ لکھنوی کے متعدد بے مثال مرثیے موجود ہیں لیکن چند مرثیوں نے بڑی شہرت پائی ان مرثیوں کے چند بند پیش خدمت ہیں۔جناب سید الشہداؑء رجز میں فرماتے ہیں۔

رنج و تکلیف میں راحت کا مزہ آتا ہے بندۂ عشق کو الفت کا مزہ آتا ہے
تشنگی میں مئے جنت کا مزہ آتا ہے صاف دل ہو تو محبت کا مزہ آتا ہے
یوں تو رکھتا ہے ہر اک شئے کو یہ پانی زندہ
مجھ کو رکھے گی مری تشنہ دہانی زندہ

جناب حر کے حال کے مرثیے میں بہار کے سلسلے میں بلبل کی گرفتاری اور قید ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔یہ مرثیہ حیدرآباد کے عزاخانہ زہراؑ میں مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم کی موجودگی میں پڑھا جسے بے حد پسند کیا گیا یہ مرثیہ تین گھنٹے میں پڑھا گیا تھا۔

بڑھی ہوئی تھی مئے عشق گل سے سرشاری چمن میں ہوتی تھی دیوار و در پہ گل کاری
میں کر رہی تھی نشیمن کی اپنے تیاری شروع موسم گل میں ہوئی گرفتاری
محبت گل تر میں اسیر دام ہوئی
چمن میں صبح ہوئی اور قفس میں شام ہوئی

تیسرا مرثیہ درحال جناب عباسؑ ہے آپ ساحل پر پہنچے ہیں، پانی دیکھ کے پیاسی سکینہؑ کی یاد آئی ہے اس وقت کے خیالات و تاثرات مندرجہ ذیل بند میں ملاحظہ ہوں۔

عباسؑ نے جلال میں دیکھا ادھر اُدھر ساحل تھا صاف نہر پہ کی غور کی نظر
تھی یاد تشنگی دل شاہ بحر و بر خود کس قدر ہے پیاس انہیں یہ نہ تھی خبر
دریا سے اس لئے تھیں نگاہیں لڑی ہوئی
پانی میں سامنے تھی سکینہؑ کھڑی ہوئی

یہ مرثیہ بھی ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ثابت ہوا، ان کی زندگی کی آخری مجلس جو ۱۹۷۴ میں شیعہ اولڈ بوائز محلہ فرنگی محل میں مایہ ناز پڑھی تھی جو آج تک لوگوں کو یاد ہے۔ اس کے بعد آنکھوں کی روشنی بہت کم ہوگئی تھی۔ اس لئے مجلس پڑھنے کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا تھا۔ اور اپنی جگہ پر مجھکو مجلسیں پڑھنے بھیجتے تھے۔

فائزدھلوی

شمالی ہند میں اردوشاعری کا ارتقاء

ولیؔ کی دکنی کی شاعری کے اثر سے دہلی میں شعروشاعری کا چرچہ پھیلا اور ولیؔ کا دیوان دیکھنے کے بعد لوگوں میں شعروشاعری کا شوق پیدا ہوا اس زمانہ میں فارسی اشعار کہے جاتے تھے خاص خاص موقعوں پر طوائف برج بھاشا میں گیت گاتی تھیں۔ مشاعروں میں فارسی شعر پڑھے جاتے تھے۔ دیوان ولیؔ کو دیکھ کر لوگوں نے محسوس کیا کہ ہم بھی اردو میں شعر کہہ سکتے ہیں چنانچہ دیوان ولیؔ کی غزلوں پر دہلی میں غزلیں کہی جانے لگیں۔ اور چند سال کے اندر دہلی میں بہت سے شعراء پیدا ہو گئے اور شمالی ہند میں اس طرح اردوشاعری نے اپنے ارتقاء کی جڑیں پھیلانا شروع کردیں۔ یہ تمام شاعر اردو میں شعر کہتے تھے شعروشاعری کا یہ ابتدائی دور ایہام گوئی کا دور کہلاتا ہے۔ یہ دور ایہام گو شعراء کا ہے جن میں شاہ حاتمؔ، ناجی ،آبروؔ، یکرنگؔ، فغاںؔ، تاباںؔ وغیرہ نے ایہام گوئی کو بڑی وسعت اور ترقی دی اور اس طرح شمالی ہند میں اردوشاعری کے ارتقاء کے آثار نمودار ہونے لگے۔

ایہام گوئی کے لغوی معنی وہم میں ڈالنے کے ہیں یعنی شعر میں کوئی ایسا لفظ لایا جاتا ہے جس کے دو معنی ہوں ایک قریب کے اور ایک بعید کے۔ لیکن شعر میں شاعر کی مراد دور کے معنی سے ہوگی لیکن اس دور میں (دور شاہی) میں ایک شاعر ایسے تھے جن کو ایہام گوئی سے دلچسپی نہیں تھی یہ تھے صدرالدین محمد فائز دہلوی ان کا شمار دہلی کے امیروں میں ہوتا تھا ان کے

پاس بڑی بڑی جاگیریں تھیں اور یہ عربی و فارسی کے عالم تھے۔ان کی بہت سی کتابیں عربی و فارسی میں موجود ہیں۔انکا تعلق دربار سے بھی تھا ۱۸۳۷ء دہلی میں اس دارِفانی سے کوچ کیا۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ان کا مختصر سا دیوان اپنے مفید مقدمے کے ساتھ چھپوا دیا ہے۔مسعود صاحب کا خیال ہے کہ ''فائز شمالی ہند کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنا دیوان اردو میں مرتب کیا۔دیوان بہت مختصر ہے اس میں کچھ غزلیں اور چھوٹی چھوٹی نظمیں پائی جاتی ہیں ۔ان کے دیوان سے ان کے عہد کے سماجی حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ تھوڑے بہت تاریخی واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔انہوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھی ہیں ۔جس میں حسن اور انسانی جذبات کا گہرا مشاہدہ ملتا ہے۔فائز کے کلام میں کوئی گہرائی نہیں پائی جاتی ان کے دل میں جس قسم کے جذبات ابھرتے ہیں اسے وہ شعر کے پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔چنانچہ انہوں نے جس قسم کے عشق کا اظہار کیا ہے وہ بہت ہی پست ہے۔وہ اپنی محبوبہ کا ہاتھ پکڑ کر گھر چلنے کو کہتے ہیں اور ان کا محبوب بھی بہت پست خیال کا معلوم ہوتا ہے۔

فائز دہلوی کی شاعری میں مقامی رنگ بہت گہرا ہے وہ ہندو مذہب سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔وہ مذہب ہندو کے خاص تہوار تلمیحات اور بزرگوں کا ذکر بڑے خاص انداز میں کرتے ہیں۔ہندی شاعری میں تشبیہات کا استعمال بہت خوبصورتی سے ملتا ہے۔فائز کی شاعری میں اس زمانہ کے میلے ٹھیلے تہواروں کا بیان بہت عمدہ طریقوں سے آیا ہے۔

فائز کی غزل گوئی پر ایک تنقیدانہ نظر:

بنیادی طور پر فائز دہلوی فارسی کے شاعر ہیں لیکن اردو میں اپنا دیوان مرتب کر کے وہ فارسی کے ان ریختہ لوگوں سے جو لوگ مزہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی شعر کہہ دیتے تھے ان سے علٰحدہ ہو گئے۔اور اس طرح وہ شمالی ہند کی اردو شاعری کے اس ابتدائی دور میں وہ اردو

ادب کی تاریخ کا حصہ ہیں۔اور اردو شاعری کی تاریخ میں گوہر نایاب کی حیثیت سے مشہور ہیں فائزؔ کی شاعری کا آغاز ولیؔ کے دیوان کے بعد سے ہوتا ہے۔

فائزؔ دہلوی نے ایہام گوئی سے پرہیز کرکے ولی دکنی کا اثر قبول کیا اور اسی رنگ سخن کو اپنایا جو ان کے تخلیقی مزاج سے زیادہ ہم آہنگ تھا۔فائزؔ کی ۶۴ ؍غزلوں میں سے ۳۳ غزلیں ولیؔ کی زمین میں ہیں۔اپنے شعری محرکات کے بارے میں فائزؔ دہلوی نے اپنے خطبہ کلیات میں خود لکھا ہے۔

آغاز شباب میں شدت وجدت اور طبیعات میں شوخی حد درجہ تھی اس کے ساتھ رغبت عشق اور حسینوں سے تعلق کے باعث شعر گوئی اور غزل گوئی کا آغاز ہو گیا تھا۔اس خاکسار نے دوسرے شاعروں کی طرح مضمون کے لئے کبھی کوشش نہیں کی۔شوق کے جزبہ نے جو کچھ دل میں آیا لکھ دیا۔

اس اقتباس سے فائزؔ کے شعری محرکات کے بارے میں دو باتیں نظر آتی ہیں ایک وصف حسن خوباں ان کی شاعری کا محبوب موضوع ہے۔دوسرے وہ دوسرے شاعروں کی طرح تلاش مضموں میں معنی اور فکر کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ غلبات شوق میں جو بھی دل میں آیا اسے فوراً شعر کا پیراہن پہنا کر پیش کر دیتے تھے یہی دونوں خصوصیات ان کے اردو کلام میں نظر آتے ہیں۔فائزؔ کے وہاں جذباتی پن اور قوت احساس کی گہرائی پائی جاتی ہے۔ بلکہ فائزؔ سامنے کی باتیں بڑی ہی سادگی سلاست کے ساتھ رواں دواں انداز میں بیان کر دیتے ہیں،مثلاً

جب سجیلے خرام کرتے ہیں مکھ دکھا جھت بنا لباس سوانر
ہر طرف قتل عام کرتے ہیں عاشقوں کو غلام کرتے ہیں

بھواں تیری شمشیرو زلفاں کمند — وہی قد فائزؔ کی جانے بہت
پلک جیسے تیری کٹاری لگے — جسے عشق کا زخم کاری لگے

اپنی شاعری میں فائزؔ دہلوی زیادہ تر ان جذبوں کا اظہار کرتے ہیں جو محبوب کے حسن اور اس کے ناز و ادا، شوخی، ظرافت، طنازی، ترچھی نگاہ، مورسی چال اور انداز دلبری جو دل عاشق میں پیدا ہوتے ہیں یا وہ محبوب کے اعضاء مثلاً بال، پلک، کمر، دانت، بازو، ہاتھ، دھن، مکھ، لب، اور قد کے اوصاف شاعری میں بیان کرتے ہیں۔لباس محبوب میں مثلاً ساڑی، اوڑھنی وغیرہ اسی کے حصے میں ذکر محبوب ہے جسے الگ الگ انداز میں مخاطب کر کے کبھی پری، چاند، کبھی دل ربا کبھی نازنین کہتے ہیں۔ان کی شاعری مین محبت والی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

غمزہ نگاہ تغافل انکھیاں سیاہ چنچل — یا رب نظر نہ لاگے انداز ہے سراپا
حسن بے ساختہ بھاتا ہے مجھے — سرما انکھیاں میں لگایا نہ کرو

جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے فائزؔ اس دور کے اعتبار سے عالم و فاضل کہے جا سکتے ہیں۔فارسی میں انکی دستگاہ کامل تھی جس کی نشاندہی انکی فارسی تحریروں سے ہوتی ہے۔فائزؔ کی تصنیفات کی تعداد پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ۲۲ قرار دی ہیں اس میں اردو دیوان کے حصہ کو چھوڑ کر سبھی تصانیف فارسی میں ہیں۔اور موضوعات کے اعتبار سے رنگا رنگ اور مختلف مزاج کے ہیں۔جس میں سے کچھ رسالوں کے نام یہ ہیں۔

اعتقاد الصدر، طریق الصدر، صراط الصدر، معارف الصدر، اختران الصدر، نجم الصدر، تحریر الصدر، ہدایت الصدر، زینت الصدر، تحفہ الصدر، رقعات الصدر، تبصرۃ الناظرین، حیاء القلوب، رسالۂ مناظرات، انیس الوزرائے محقق، ارشاد الوزرا، رسالۂ مالیخولیا، خطبہ کلیات فائز، دیوان فارسی

فائزؔ کے اردو کلام کے بارے میں کریم الدین نے اپنے ''تذکرہ طبقات اشعراء میں لکھا ہے'' اس نے ایک دیوان غزلیات اور قصیدہ اور چھ مثنویات کا لکھا ہے

ایک مثنوی بیان پنگھٹ ، دوسری جوگن ، تیسری مالن ، چوتھی گوجری ، پانچویں بھینگڑن چھٹا رقعہ ہیں ۔ فائزؔ کی کچھ تصانیف دستیاب نہیں ہو سکی ہیں مگر ان کا ذکر ملتا ہے ان کو بھی شامل کرلیا جائے اور اردو کے کلام کا الگ کتابی شکل میں مرتب ہونا تسلیم کرلیا جائے تو فائزؔ کی کل تصنیفات کی تعداد ہوتی ہے۔

فائزؔ سے پہلے اردو غزل وجود میں آچکی تھی دکن میں اس کا فروغ ہو چکا تھا اور ولیؔ نے اسے فارسی رنگ و آہنگ بخشا تھا۔ فائزؔ نے اپنا چراغ ولیؔ کی شاعری سے روشن کیا اس کا واضح ثبوت وہ غزلیں جو ولیؔ کی طرح میں لکھیں گئیں ہیں ۔ ولیؔ اور فائزؔ میں متابقت حسب ذیل اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ولیؔ	فائزؔ
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا	مجھ پاس کبھی قد شمع تاد نہ آیا
شاید کہ میرا حال اسے یاد نہ آیا	اس گھرنے میں وہ دل بر استاد نہ آیا
جسے عشق کا تیر کاری لگے	تری گالی مجھ دل کو پیاری لگے
اسے زندگی جگ میں بھاری لگے	دعا میری تجھ من میں بھاری لگے

فائزؔ کی زبان اور آج کی اردو زبان میں بہت فرق ہے مگر اتنا فرق نہیں کہ فائزؔ کی شاعری کو سمجھنے میں دشواری ہو۔

ایسے لفظ ضرور پائے جاتے ہیں جو اس زمانے میں متروک ہوگئے ۔ وہ دکنی الفاظ جو دکنی شاعری میں عام تھے شمالی ہند میں بعد کے شعراء نے انہیں ترک کردیا۔

لکھنؤ کے دو پُر مزاح شاعر

مہذبؔ و رنگینؔ

حضرت مہذبؔ بالطبع بہت ہی بذلہ سنج پر مذاق اور ہنس مکھ واقع ہوئے ہیں ۔مہذبؔ صاحب جس محفل میں بیٹھ گئے اس کو زعفراں زار بنا دیا ان کی لطیفہ گوئی، پر مذاقی ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے لیکن طبیعتاً وہ جتنے پر مذاق ہیں اپنے کام میں وہ اتنے ہی سنجیدہ اور محنتی ہیں ۔ دیکھنے میں بالکل نحیف الجثۃ لیکن ہمت ،عزم ،محنت اور لگن میں گویا پہاڑ ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مہذبؔ الغات کی شکل میں ان کا یہ لافانی اور لاثانی کارنامہ ادبی دنیا میں آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بنے گا۔

رنگینؔ لکھنوی چونکہ یہ خود بھی بہت پر مذاح واقع ہوئے تھے لہٰذا دونوں میں دوستی مرتے دم تک بغیر کسی اختلاف کے برقرار رہی وہ بات اور ہے کہ آخری عمر میں مہذبؔ لکھنوی آنکھوں سے اور خود رنگین صاحب ٹانگوں سے معذور ہونے کی بنا پر ملاقاتوں کا سلسلہ کم ہو گیا تھا۔مہذبؔ لکھنوی کی فطرت میں مزاح تھا اس لئے طنز و مزاح کی چاشنی ان کے سلاموں مرثیوں غزلوں میں نظر آئے گی خلاصہ یہ ہے کہ نظم و نثر دونوں میں لطف پائیں گے ۔اسی طرح ان کی ایک کتاب دور شاعری کے نام سے لکھی ہے جو دو حصوں میں طبع ہوئی ہے اس کتاب کا بھی کوئی جواب نہیں ہے اس میں نا دلانہ رنگ میں دو فرضی شاگرد مولانا صاحب اور نواب صاحب ہیں جو ہر ہفتے اپنی غزلیں استاد کے پاس لاتے ہیں ان غزلوں میں عمداً شعری

عیوب نظم کئے گئے ہیں اور جب شاگرد غزل لاتا ہے تو استادان عیوب اور نقائص کے بارے میں شاگرد کو بتاتا ہے علم عروض اور شعر گوئی کے تمام مسائل اس کتاب میں خوبصورتی کے ساتھ جمع کر دئے گئے ہیں کہ اس کو پڑھنے کے بعد کوئی عروضی غلطی کسی سے سرزد نہیں ہوسکتی ۔ یہ کتاب کے دونوں حصہ نہایت پر لطف انداز میں تحریر ہوئے ہیں اس کتاب میں نظم ونثر دونوں کا مزا پائیں گے ۔اب چند مثالیں مرثیے سے جہاں چہرہ نظم کیا ہے اس میں بھی مزاح کی چاشنی نظر آئے گی ۔اس مزاح کے انداز میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں جو واقعا حقیقت ہوتی ہے مثال کے طور پر یہ دو بند ملاحظہ ہوں ۔

ہے تو مطلب کی ملاقات محبت کیسی
کام بن جائے یہی فکر ہے الفت کیسی
ہائے اس دور میں آئی ہے قیامت کیسی
مکر کے بھیس میں چلتی ہے سیاست کیسی
جو صداقت کا تھا عنوان وہ عنوان نہیں
دوست دشمن کی اب اس عہد میں پہچان نہیں

رات دن لیکے غرض بزم میں آتے ہیں ضرور
کہتے رہتے ہیں ہر اک بات میں سرکار حضور
کام بن جانے پر ہو جاتے ہیں ایسے مستور
جیسے یہ مل گئے ان سے کہ جو ہیں جان سے دور
یہی رفتار زمانے کی نظر آتی ہے
پھر کبھی خود نہیں آتے ہیں خبر آتی ہے

اب ایک دوسرے مرثیے کے چہرے میں زمانے کا حال نظم کیا ہے یہ بند بھی ملاحظہ ہو۔

اب کیجئے ضمیر فروشی جہان میں آواز صدق اب نہیں آئے گی کان میں
آیا ہے اور آئے گا فرق آن بان میں جو بات کیجئے وہ ہماری زبان میں
جلدی طلسم اپنے ارادوں کو توڑ کے
ہم کو سلام کیجئے ہاتھوں کو جوڑ کے

ایک دوسرے بند میں مشاعروں کی بگڑتی ہوئی صورت حال اور تہذیب کی پامالی کا ذکر ہے ملاحظہ ہو۔

کیا پڑھے بزم سخن میں کوئی نظم عالی آج کل مدح تمسخر سے نہیں ہے خالی
دل کے ارماں کی نہ کیوں بزم میں ہو پامالی شعر پڑھئے تو بجاتا ہے زمانہ تالی
تھا جو تعریف کا عنوان وہ عنوان نہیں
ہے حقیقت کہ بناتے ہیں یہ پہچان نہیں

سلاموں سے چند مثالیں پیش ہیں:

مجھ پر اٹھا کے گرز ملک پیچھے ہٹ گئے میں نے جو سر جھکا کے لیا مرتضیٰؑ کا نام

ایک سلام کے تین شعر مسلسل ملاحظہ ہوں:

ہو گئی حد لاش تک اٹھتی نہیں گر زر نہ ہو مر کے بھی ہوتی ہیں انساں کو ضرورت مال کی
اس نے دلوایا کمینوں کو شرافت کا خطاب دیکھتے ہیں آپ دنیا میں جسارت مال کی
زر کا بندہ کیوں کرے مفلس عزیزوں کا خیال جب ہر اک رشتے سے بہتر ہے قرابت مال کی

ایک دوسرے سلام سے مثال پیش ہے۔

قتل مرحب بن گیا تمہیدِ فتح مرتضیٰؑ
روح نکلی ایک کی اور کھنچ گئی لشکر کی جان

ایک دوسرے سلام سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

مشکل میں ہم علیؑ کو پکاریں گے رات دن
رکھا ہے اپنے نام پہ کیوں مرتضیٰؑ کا نام

مہذبؔ لکھنوی کے دوست رنگینؔ لکھنوی کے سلسلے میں چند چیزیں تحریر ہیں آپ ہزل گوئی کے بادشاہ تھے اتنے خوبصورت پیرائے میں پر مزاح بات نصیحت آمیز انداز میں کہتے ہیں کہ پڑھنے والا لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت نصیحت بھی حاصل کرتا ہے۔آپ کی ہزل گوئی کا ایک ایک شعر بامعنی اور سبق آموز ہے۔مہذب الغات کی مختلف جلدوں میں آپ کے اشعار مثالوں میں پیش کئے گئے ہیں۔رنگینؔ لکھنوی کی ہزل کے چند اشعار اور زریں اقوال ناظرین کے تفنن طبع کے لیے پیش کئے جائیں گے۔

آپ کے احباب:

رنگینؔ لکھنوی کے دوستوں میں مہذبؔ لکھنوی، پھکّاؔ صاحب، ماچسؔ لکھنوی، معززؔ لکھنوی، بابوؔ صاحب بی اے، گروسرن ادیبؔ لکھنوی، احمدؔ صاحب فضاؔ، ڈاکٹر سید ینؔ، رفیعؔ احمد قدوائی، پیارے صاحب خاموشؔ، اکمالؔ لکھنوی، انورؔ رائے بریلوی، زاہدؔ جلال پوری، عالمؔ لکھنوی، خنداںؔ لکھنوی، حسنؔ لکھنوی، مولانا مرزا محمد اشفاق شوقؔ لکھنوی، ڈاکٹر باقر مہدی۔

آپ کے احباب کی فہرست بہت طویل ہے چند نام دئے گئے ہیں آپ کے دوستوں میں رفیع احمدؔ قدوائی جو آپ پر حد درجہ مہربان تھے اور انہیں کی عنایت و مہربانی سے

وکٹوریہ گنج ہاسپٹل میں ملازمت ملی۔ جب ہندوستان سے مکہ حج زائرین کے لئے میڈکل ٹیم جاتی تھی تو اس میں آپ وارڈ بوائے کی حیثیت سے جاتے تھے تو اس صورت سے کئی مرتبہ آپ کو زیارتوں اور حج کا شرف حاصل ہوا۔ طبیعتاً پر مزاح تھے اس لئے ہر کے ہر دل عزیز تھے۔ زمانہ قدیم وجدید دیکھا تھا اور استادان فن کی صحبت اُٹھائی تھی لہٰذا زابردست زبان پر عبور رتھا۔

تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان سے لے کر بازاری اور عورتوں کی زبان سے بخوبی واقفیت تھی۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کے نمونے کلام میں جابجا ملتے ہیں۔ ہزل کے ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے پورے کلام میں لگاؤ اور دلچسپی پائی جاتی ہے آپ عزیز لکھنوی جیسے استاد کے شاگرد تھے اسی لئے آپ علم عروض اور شاعری کے تمام رموز و نکات سے واقف تھے۔ اور آپ کی یہ بھی خصوصیت تھی جب کوئی مذاق کی بات یا جملہ کہتے تھے تو قطعاً چہرے پر ہنسی نہیں آتی تھی اور بہت سادگی سے اپنی بات کہہ جاتے تھے۔ ان کے مزاج سے واقف حضرات ان کے جملوں کا لطف اُٹھاتے تھے اور مزا لیتے تھے۔ اور جب رنگین لکھنوی اور مہذب لکھنوی ایک ساتھ جمع ہوتے تھے تو پھر زبان کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔

رنگین لکھنوی کی ہزل کے ہر شعر میں ایک خوبی یا کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ اور محاورات کا برجستہ استعمال انہیں کی خوبی تھی۔ اپنے ہزل کے مطلے میں کہتے ہیں:

وہ اپنے چاہنے والوں کو آزما نہ سکے
تھی موچ ہاتھ میں ایسی کہ تیغ اٹھا نہ سکے

یا اسی ہزل کے دوسرے شعر میں آشوب چشم کو موضوع بنایا ہے اور اس میں مزاح

کیا خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہتے ہیں:

تھا اتفاق سے آشوبِ چشم دونوں کو
ہم ان سے اور وہ ہم سے نظر ملا نہ سکے

ایک تاریخی واقعے کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے جس میں طنز و مزاح کی چاشنی ملے گی جو انہیں کا خاصہ ہے فرماتے ہیں:

تھا جس کے دم سے یہ حمام گرم دہلی کا
فرنگیوں نے بجھا تو دیا جلا نہ سکے

اردو میں ایک مثل ہے کہ آسمان کا تھوکا منھ پر آتا ہے اس شعر میں بھی کیا خوبی پیدا کی ہے یہ لکھنؤ کی خصوصیت ہے جو اس شعر سے ظاہر ہے:

فلک پہ تھوکنے والوں یہ کیا حماقت ہے
اگالدان میں تھوکو جو منھ پہ آ نہ سکے

رنگینؔ لکھنوی نے مقطع میں کیا کمال کیا ہے ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا ہے جس سے انکار ناممکن ہے۔ کہتے ہیں:

نکاح آپ نے رنگینؔ کیا کمال کیا
یہ بار وہ ہے فرشتے جسے اٹھا نہ سکے

درج ذیل اقوال زریں اپنی نوعیت کے عجیب وغریب ہیں ہر قول حقیقت سے قریب ہے کتنی محنت و مشقت اٹھائی ہوگی یہ مرحوم کا دل جانتا ہوگا معلومات کا ایک خزانہ ہے۔

کس کو کس کی ضرورت ہے

۱)	مفلس کو دولت کی	۱۰)	بوسیدہ مکان کو مرمت کی
۲)	بیمار کو صحت کی	۱۱)	دولت مند کو شان و شوکت کی
۳)	گنہگار کو رحمت کی	۱۲)	معشوق کو صورت کی
۴)	جوان کو عورت کی	۱۳)	فقیر کو ریاضت کی
۵)	بڈھے کو راحت کی	۱۴)	ملازم کو فرصت کی
۶)	شاعر کو شہرت کی	۱۵)	بچوں کو تربیت کی
۷)	کمزور کو طاقت کی	۱۶)	ملازمین کچہری کو رشوت کی
۸)	پھولوں کو رنگت کی	۱۷)	دعا کو اجابت کی
۹)	گویّے کو سنگت کی	۱۸)	افسران کو دعوت کی

حضرت مہذبؔ اور حضرت رنگینؔ کو ایک ساتھ پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین بیک وقت دو استادوں کے کلام سے لطف اندوز ہو سکیں۔

دیوار چین (یا ختا)

ایک مشہور دیوار کا نام جو تاتار یا ختا کی سرحد پر واقع ہے۔اس کے طول کی نسبت مختلف روایتیں ہیں کسی نے آٹھ سو کوس لمبی لکھی ہے کسی نے تین ہزار میل کسی نے بارہ سو میل مگر کم سے کم آٹھ سو کوس پر اتفاق کرنا چاہئے۔

باعث تعمیر یہ ہے کہ جب تاتاریوں نے بار بار چڑھائی کر کے ختائیوں کو نہایت تنگ اور عاجز کر دیا اور انہیں بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ بن پڑی تو فغفور چنگ وائی نے سنہ عیسوی سے دو سو چالیس برس پیشتر اس کی بنیاد ڈالی باوجودیکہ مسافت آٹھ سو کوس کی ہے مگر صرف پانچ برس کی قلیل مدت میں تیار کر لی اس طویل فاصلہ میں نہ تو بلند اور دشوار گزار پہاڑ ہارج ہوئے اور نہ عظیم الشان دریاؤں نے مزاحمت کی اور اگر کی بھی تو اس کے بانی کسی خطرے کو خیال میں نہ لائے۔ یہ دیوار کئی مقام پر آدھے آدھے کوس کے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنتی چلی گئی ہے اور اکثر جگہ دریاؤں پر بڑے بڑے پل باندھے گئے جو اس وقت بجائے خود حیرت انگیز ہیں۔سمندروں کا سامنا ہوا تو سیکڑوں جہاز پتھروں کے بنے ہوئے تہ تک ڈبو کر ان پر چنائی کی گئی۔آٹھ سو کوس تک یہ دیوار برابر تیس گز بلند چلی گئی ہے اور چوڑی بھی اتنی ہے کہ کئی گھوڑے پہلو بہ پہلو آسانی کے ساتھ اس پر دوڑائے جا سکتے ہیں۔ ہر سو سو قدم پر دو منزلہ اور سہ منزلہ برج بنے ہوئے ہیں۔تاتاری حکومت کے قبل ان پر سیکڑوں توپیں چڑھی رہتی تھیں اور دس لاکھ فوج ان برجوں میں پڑی رہتی تھی مگر جب سے تاتار پر یہ لوگ خود

قابض ہو گئے تب سے یہ فوج ہٹالی گئی۔اور دیوار کی مرمت بھی بند ہوگئی۔زمانے کا انقلاب اسے کہتے ہیں یہی دیوار ہے جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتی ہے۔یہی دیوار ہے جس پر ختائیوں کی حکمت عملی اور مستقل مزاجی دانائی ختم ہے۔ان لوگوں نے آدھ آدھ کوس کے بلند پہاڑوں پر اس آسانی سے بڑی بڑی سلیں پہنچائیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ناہموار اور بے ڈھنگ پہاڑوں پر گزوں لمبی سلوں کا چڑھا دینا کچھ آسان کام نہیں ہے۔بعض موقع تو ایسے ہیں کہ وہاں پرند کے سوا انسان کا جانا ہی تعجبات میں سے ہے اگر علم جرثقیل سے یہ بات آسان کر بھی لی جائے تو بحر ذخار میں کیا جواب بن سکتا ہے۔دو ہزار برس سے زیادہ زمانہ گزر گیا لیکن دیوار نے نہ کہیں جنبش کھائی نہ طوفان نے ستایا نہ بارشوں نے گرایا۔پانچ برس تک اس ملک کے آدھے باشندے حکماً اس دیوار کی تعمیر پر لگے رہے۔اس سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جہاں جہاں سے وہ دیوار گزری وہاں کوہسار، ریگستان اور ویرانے کے سوا کچھ نہیں۔اس لئے اتنے آدمیوں کی رسد کا انتظام بھی ناممکن ہے۔غرض ختائیوں کی ثابت قدمی اور حکمت نے سب مشکلوں کو آسان کر دیا۔سچ پوچھو تو دیوار قہقہہ یہی ہے۔مزید تفصیل صاحب فرہنگ آصفیہ نے دیوار قہقہا کے بارے میں لکھی ہے۔دیوار قہقہہ ایک مزہباً مانی ہوئی دیوار ہے جسکو سد سکندری بھی کہتے ہیں اس کی نسبت اعتقاد کیا جاتا ہے کہ جب سکندر ذوالقرنین مشرق ومغرب تک اپنی سلطنت قائم کر چکا تو شمال کی طرف بڑھا۔جب انتہائے دنیا پر پہنچا تو وہاں پر دو پہاڑ دیکھے جو دیوار کی مانند کنارہ عالم پر واقع ہیں۔ان دونوں کے بیچ میں ایک درہ ہے ایک قوم جو دونوں پہاڑوں کے دامن میں رہتی تھی اس نے سکندر کا جاہ وحشم دیکھ کر سمجھ لیا کہ بادشاہ عالم یہی ہے۔مگر سکندر اس قوم کی زبان نہیں سمجھتا تھا قوم نے سکندر سے اشاروں میں فریاد کی کہ ان پہاڑوں کے دوسری طرف یاجوج ماجوج نامے آباد ہیں وہ

اس درہ کی راہ سے آ کر ہم کو لوٹ لے جاتے ہیں اور برباد کر جاتے ہیں۔ ہمارے لئے کوئی روک اور رخنہ اس قوم سے بچنے کے لئے بنا دیجئے۔ لہٰذا سکندر نے اینٹوں کے بجائے لوہے کی تختیاں تیار کرا کے ساٹھ گز چوڑی دیوار دونوں پہاڑوں کی چوٹیوں تک بلند کر دیں جس میں گارے کے بجائے پگھلا ہوا تانبہ کام میں لایا گیا اس دیوار سے ان مفسد قوموں کی راہ بند ہو گئی۔ اب وہ مفسد قومیں اس دیوار کو ہمیشہ کھودتی رہتی ہیں۔ جب وہ گرنے کے قریب پہنچ جاتی ہے تو خدائے تعالیٰ ان لوگوں پر نیند طاری کر دیتا ہے اور دیوار قدرت الٰہی سے درست ہو جاتی ہے۔ شبانہ روز یہی دستور جاری ہے۔ قیامت کے قریب وہ دیوار ٹوٹ جائے گی اور وہ دونوں قومیں درے کی راہ سے نکل کر ٹڈی کے مانند عالم میں پھیل کر اہل زمین کو تاراج و برباد کر دیں گی۔ عوام کا یہ خیال ہے کہ اس کے دوسری طرف کا حال کوئی نہیں بیان کر سکتا جو شخص اوپر چڑھ جاتا ہے وہ دیکھ کر ایسی حالت میں ہو جاتا ہے کہ ہنستے ہنستے مر جاتا ہے اور وہاں کی کچھ کیفیت بیان نہیں کر پاتا ہے اسی خیال سے اس دیوار کا نام عوام نے دیوار قہقہہ رکھ لیا ہے چنانچہ اردو کے شعراء ذوقؔ دہلوی اور ظفرؔ دہلوی نے نظم کیا ہے دونوں اشعار حسب ذیل ہیں:

ہنسے جو وہ مرے رونے پہ تو صف مژگاں
نہ سمجھو تم اسے دیوار قہقہہ سمجھو
(ذوقؔ)

ہر ایک دیکھ کے صورت کو میری ہنستا ہے
الٰہی میں کوئی دیوار قہقہہ ٹھہرا
(ظفرؔ)

میر تقی میرؔ

اردو کے عالم گیر شہرت رکھنے والے شاعر کا تخلص۔محمد تقی نام، باپ کا نام میر عبداللہ ۔آب حیات کے مصنف مولانا محمد حسین آزادؔ ان کے حالات کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ یہ شرفائے اکبرآباد میں سے تھے۔میرؔ صاحب کو ابتداء سے شعر کا شوق تھا۔باپ کے مرنے بعد دلی میں آئے اور خان آرزوؔ کے پاس انھوں نے اور انکی شاعری نے پرورش پائی۔مگر خان صاحب حنفی مذہب کے تھے اور میرؔ صاحب شیعہ اس پر نازک مزاجی غضب! غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے۔بدنظر زمانہ کا دستور ہے کہ جب کسی نیک نام کے دامن شہرت کو ہوا میں اڑتے دیکھتا ہے تو ایک داغ لگا دیتا ہے۔چنانچہ تذکرہ شورش میں لکھا ہے کہ خطاب سیادت انہیں شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا۔پھر بھی اتنا کہنا واجب سمجھتا ہوں کہ ان کی مسکینی و غربت اور صبر وقناعت ،تقویٰ وطہارت مختصر بنا کر ادائے شہادت کرتے ہیں کہ سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہئے اور زمانے کا کیا ہے کسی کو کیا نہیں کہتا اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے:

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

غرض ہر چند کہ تخلص ان کا میرؔ تھا مگر گنجفہ سخن کی بازی میں آفتاب ہو کر چمکے۔ قدردانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اڑا دیا ہندوستان میں یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو بطور تحفہ ایک شہر

سے دوسرے شہر میں لے جاتے تھے۔ اگرچہ دلی میں شاہ عالم کا دربار اور امرا د شرفاء کی محفلوں میں ادب ہر وقت ان کے لئے جگہ خالی کرتا تھا اور ان کے جوہر کمال اور نیکی استوار افعال کے سبب سے سب عظمت کرتے تھے مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے اور وہاں تو خود خزانہ سلطنت خالی پڑا تھا اس لئے ۱۱۹۰ھ میں دلی چھوڑنا پڑی۔

جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی یہ اس طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے بیشک گاڑی میں بیٹھئے مگر باتوں سے کیا تعلق اس نے کہا۔ حضرت کیا مضائقہ راہ کا شغل ہے باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے۔

لکھنؤ میں پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے کہ ایک سرا میں اترے معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے رہ نہ سکے اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں جا کر شامل ہوئے ان کی وضع قدیمانہ، کھڑکی دار پگڑی پچاس گز کے گھیر کا جامہ ایک پورا تھان پستو لئے کا کمر سے بندھا، ایک رومال پٹری دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں۔ مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائچے ناگ پھنی کی انی دار جوتی۔ جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب۔ غرض جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ نئے انداز نئی تراشیں بانکے ٹیڑھے جوان جمع انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میرؔ صاحب بیچارے غریب الوطن زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ تھے اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظریں پڑیں اور

بعض اشخاص نے پوچھا حضور کا وطن کہاں ہے؟ میرؔ صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھے ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روز گار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا بہت معذرت کی اور میرؔ صاحب سے عفو تقصیر چاہی۔ کمال کے طالب تھے۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میرؔ صاحب تشریف لائے رفتہ رفتہ آصف الدولہ مرحوم نے سنا اور دو سو روپیہ مہینہ کر دیا۔

عظمت و اعزاز جو ہر کمال کے خادم ہیں اگر چہ انھوں نے لکھنؤ میں بھی میرؔ صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا مگر انھوں نے بھی بد دماغی اور نازک مزاجی کو جوان کے ذاتی مصاحب تھے اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا۔ چنانچہ کبھی کبھی نواب صاحب کی ملازمت میں جاتے تھے۔

ایک دن نواب مرحوم نے ایک غزل کی فرمائش کی ۔ دوسرے تیسرے دن جو پھر گئے تو پوچھا کہ میرؔ صاحب ہماری غزل لائے میرؔ صاحب نے تیوری بدل کر کہا جناب عالی مضمون غلام کی جیب میں تو بھریں ہیں نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کر دے۔ اس فرشتہ خصال نے کہا خیر میرؔ صاحب جب طبیعت حاضر ہو گی کہہ دیجئے گا۔

ایک دن نواب آصف الدولہ نے بلا بھیجا جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے

کنارے کھڑے ہیں ہاتھ میں چھڑی ہے پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میرؔ صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میرؔ صاحب کچھ فرمایئے۔ میرؔ صاحب نے غزل سنانی شروع کی نواب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہاں پڑھیئے میرؔ صاحب چیں بجبیں ہوئے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے اور نواب کہتے جاتے تھے کہ ہاں پڑھئے آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے اور بولے کہ پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں سے کھیلتے ہیں متوجہ ہوں تو پڑھوں نواب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کر دے گا میرؔ صاحب کو یہ بات ناگوار گزری غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے۔ اور پھر جانا چھوڑ دیا چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے نواب کی سواری سامنے سے آ گئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میرؔ صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا کبھی تشریف نہیں لاتے۔ میرؔ صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا داب شرفا نہیں یہ کیا گفتگو کا موقع ہے غرض بدستور گھر میں بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گزارہ کرتے رہے آخر ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے اور سو برس کی عمر پائی۔ ناسخؔ نے تاریخ کہی ۔واویلا مُرد شہ شاعراں

تصنیفات کی تفصیل: آپ کے چھ دیوان غزلوں کے ہیں۔ چند صفحے ہیں جن میں فارسی کے عمدہ متفرق شعروں پر اردو مصرعہ لگا کر مثلث اور مربع کیا ہے۔ اور یہ ایجاد ان کا ہے رباعیاں مستزاد، چند صفحے چار قصیدے منقبت میں اور ایک نواب آصف الدولہ کی تعریف میں چند مخمس اور ترجیع بند مناقب میں چند مخمس شکایت زمانہ میں جن سے بعض اشخاص کی ہجو مطلوب ہے۔ دو واسوخت ایک ہفت بند ملا حسن کاشی کی طرز پر حضرت شاہ ولایت کی شان میں ہے بہت سی مثنویاں جن کی تفصیل عنقریب واضح ہوتی ہے۔ تذکرہ نکات الشعراء

شاعران اردو کے حال کا کہ اب بہت کمیاب ہے۔ایک رسالہ مسمیٰ بہ فیض میر معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کو تاریخ گوئی کا شوق نہ تھا۔

غزلوں کے دیوان اگرچہ رطب و یابس سے بھرے ہوئے ہیں مگر جو ان میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم انتخاب میں اردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں ستر اور بہتر نشتر ہیں باقی میر صاحب کا تبرک ہیں۔لیکن یہ بہتّر کی رقم فرضی ہے۔انہوں زبان اور خیالات میں جس قدر فصاحت اور صفائی پیدا کی ہے اتنا بلاغت کو کم کیا ہے۔یہی سبب ہے کہ غزل اصول غزلیت کے لحاظ میں سوداؔ سے بہتر ہے ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے۔اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دل عزیز ہے۔

قصائد کی کیا کیفیت ہے: چونکہ مطالب کی دقت مضامین کی بلند پروازی الفاظ کی شان وشکوہ، بندش کی چستی لازمہ قصائد کا ہے وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش وخروش کا ثمر ہوتا ہے۔اسی واسطے میرؔ صاحب کے قصیدے کم ہیں۔

امراء کی تعریف میں قصیدے نہ لکھنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل وقناعت انھیں بندے کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے یا خود پسندی یا خود بینی جو انہیں اپنے میں آپ غرق کئے دیتی تھی وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی۔واسوخت دو ہیں اور کچھ شک نہیں کہ لاجواب ہیں،اہل تحقیق نے فغانیؔ یا وحشیؔ کو فارسی میں اور اردو میں انہیں واسوخت کا موجد تسلیم کیا ہے۔

مناقب میں جو مخمس اور ترجیع بند وغیرہ ہیں حقیقت میں حسن اعتقاد کا حق ادا کر دیا ہے وہ ان کے صدق دل کی گواہی دیتے ہیں مثنویاں مختلف بحروں میں ہیں جو اصول مثنوی کے ہیں وہ میرؔ صاحب کا قدرتی انداز واقع ہوا اس لئے بعض بعض لطف سے خالی نہیں۔ان

میں شعلہ عشق، دریائے عشق نے اپنی خوبی کا انعام شہرت کے خزانے سے پایا۔

دوسری مثنویاں یہ ہیں ۔ جوش عشق ، اعجاز عشق ، خواب و خیال ، معاملات عشق ، مثنوی شکار نامہ، اپنی بلی ، برسات کا سفر، اور ایک مثنوی اپنی بکری کے حال میں کہی ہے ۔مثنوی تنبیہ الخیال۔

میرؔ صاحب میانہ قد، لاغر اندام ، گندمی رنگ تھے ۔ ہر کام متانت اور آہنگی کے ساتھ، بات بہت کم وہ بھی آہستہ آواز میں نرمی اور ملائمت عادت و اطوار نہایت سنجیدہ اور متین اور صلاحیت اور پرہیز گاری نے اسے عظمت دی ساتھ اس کے قناعت و غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی اسی کا نتیجہ ہے کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کی بھی برداشت نہ رکھتے تھے۔

جب نواب آصف الدولہ مر گئے ۔سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ دربار جانا چھوڑ چکے تھے وہاں کسی نے طلب نہ کیا۔ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی یہ تحسین کی مسجد چوک لکھنؤ پر سر راہ بیٹھے تھے سواری سامنے آئی سب اٹھ کھڑے ہوئے میرؔ صاحب اسی طرح بیٹھے رہے۔سید انشؔا خواصی میں تھے۔نواب نے پوچھا کہ انشا یہ کون شخص ہے عرض کی کہ جناب عالی یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم آج بھی فاقے ہی سے ہوگا۔سعادت علی خاں نے آکر خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا۔جب چوبدار لے کر گیا، میرؔ صاحب نے واپس کر دیا اور کہا کہ مسجد میں بھیجئے یہ گنہگار اتنا ہی محتاج نہیں ۔سعادت علی خاں یہ جواب سن کر متعجب ہوئے مصاحبوں نے پھر سمجھایا، غرض نواب کے حکم سے سید انشاء خلعت لے کر گئے اور اپنی طرز پر سمجھایا کہ نہ اپنے حال پر بلکہ عیال پر رحم کیجئے اور بادشاہِ وقت کا ہدیہ ہے اسے قبول کیجئے ۔میرؔ صاحب نے کہا، صاحب وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں کوئی ناواقف اس طرح

پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف، میرے حال سے واقف اس پر اتنے دنوں کے بعد دس روپئے کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔ مجھے اپنا فقر وفاقہ قبول ہے مگر یہ ذلت نہیں اٹھائی جاتی۔ سید انشاء کی لفاظی اور لسانی کے سامنے کس کی بات پیش جا سکتی تھی میرؔ صاحب نے قبول فرمایا اور دربار میں کبھی کبھی جانے لگے۔ نواب سعادت علی خاں مرحوم ان کی ایسی خاطر کرتے تھے کہ اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتے تھے اور اپنا پیچوان پینے کو دیتے تھے۔

میرؔ کی مرثیہ گوئی: اس ذیل میں مراثی میرؔ، مرتبہ ڈاکٹر مسیح الزماں مطبوعہ انجمن محافظ اردو کے مقدمے میں مسیح الزماں لکھتے ہیں کہ اردو ادب کے مورخین کو اس میں شبہ نہیں کہ میرؔ نے مرثیہ کہے ہیں لیکن ان کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا متعدد اشاعتیں جو میری نظر سے گزریں ان میں بھی کوئی مرثیہ شامل نہیں ہے۔ ایک عرصہ تک کلیات سودا کے رسالہ سبیل ہدایت میں جس مرثیہ پر اعتراضات کئے گئے ہیں اسے لوگ میر تقی میر کا سمجھتے رہے۔ لیکن شیخ چاند نے اپنے تحقیقی مقالے "سودا" اس غلط فہمی کو دور کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ مرثیہ کہ جس کا پہلا بند یہ ہے۔

مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے — دلوں پر محبوں کے عالم عجب ہے
حسینؑ علیؑ کی شہادت کی شب ہے — غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے

میر کا نہیں ہے بلکہ اس زمانے کے ایک اور مرثیہ گو میر محمد تقی عرف میر گھاسی المتخلص بہ تقی کا ہے۔

۱۹۲۸ء میں رسالہ نیرنگ رام پور نے میر نمبر نکالا تھا جس میں میر کے نو مرثیوں کا ذکر کر کے ان میں ہر ایک پہلا بند شائع کیا ہے۔ کلیات میر کے قلمی نسخوں میں ہماری نظر سے صرف دو ایسے گزرے ہیں جن میں ان کے مرثیہ شامل ہیں ان میں سے ایک رضا لائبریری رام پور میں ہے دوسرا پروفیسر مسعود حسن رضوی کے ذاتی کتب خانہ میں ہے رام پور کے نسخے

میں صرف نو مرثیہ ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن کے نسخے میں ۳۹ مرثیے اور سلام ہیں۔ رام پور کے نسخے میں صرف دو مرثیہ ایسے ہیں جو مسعود حسن رضوی کے نسخے میں نہیں ہیں اس طرح میرؔ کے کل اکتالیس مرثیے اور سلام دستیاب ہیں۔ میرؔ نے مرثیے، مسدس، مربع، ترجیع بند، ترکیب بند اور منفردہ لکھیں ہیں جن میں مربع زیادہ ہیں۔

مرزا رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، مرزا جان جاناںؔ، مظہرؔ، قائمؔ، یقینؔ، وغیرہ ان کے ہم عصر مصحفیؔ، جرأتؔ اور میر انشاء اللہ خاں انشاءؔ نے آخری عہد میں ظہور کیا۔

میرؔ صاحب کے ایک بیٹے میر کلو عرش تھے۔ ایک پیر مرد، بے پرواہ، مستغنی المزاج تھے میر عسکری نام عرش تخلص۔ میر کلو مشہور تھے صاحب دیوان شاعر تھے اور چند شاگرد تھے۔ ایک شعر ان کی غزل مشاعرہ کا لکھنؤ میں زباں زد خاص و عام ہے۔

آسیہ کہتی ہے ہر روز باآواز بلند
رزق سے بھرتا ہے رزاق دہن پتھر کے

موئف مہذب الغات نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ میر کلو عرش کسمپرسی کے عالم میں مشہور مرثیہ گو سید حسین میرزا عشقؔ جن کا شمار روساء شہر میں ہوتا تھا ان کے یہاں پہنچے تعارف ہوا انہوں نے بکمال احترام وقدردانی اپنے گھر میں جگہ دی اور عرشؔ وہیں رہنے لگے یہاں تک کہ وہ مثل اہل خانہ سمجھے جانے لگے بعد انتقال حسب وصیت باغ میر عشق رکاب گنج میں میر عشقؔ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ بعد تذکرہ نویسوں نے ان کی وفات کا سن ۱۸۰۸ء لکھا۔ ان کی عمر تذکرہ نویسوں کی تحقیق کے موافق ۸۰ اور ۹۰ سال کے درمیان تھی۔ مؤلفہ گلستان ہزار رنگ سید بہاالدین احمد آرا بہار نے انکی ولادت ۱۷۲۶ء اور وفات ۱۸۱۴ء لکھی ہے۔ اس پر سب لوگوں کو اتفاق ہے کہ میر کا انتقال لکھنؤ میں ہی ہوا۔ لیکن قبر کا صحیح پتا نہیں ہے کہ کس جگہ ہے۔

میر انیسؔ کی مرثیہ گوئی

پڑھتے ہیں لوگ مرثیہ گھر گھر انیس کا
مقبولیت کی ہو گئی دنیا میں انتہا

مہذبؔ

لکھنؤ کے ایک ممتاز شاعر اور بےمثل مرثیہ نگار میر ببر علی کا نام انیس تخلص

آپ میر مستحسن خلیقؔ کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور اپنے والد ماجد ہی کے شاگرد بھی تھے۔ آپ مصنف سحر البیان یعنی میر حسن کے پوتے اور میر ضاحکؔ ہم عصر سوداؔ کے پروتے تھے۔ میر انیسؔ اپنے ابتدائی دور شاعری میں غزل بھی کہتے تھے مگر اپنے والد بزرگوار کے ایما پر مرثیہ گوئی کی طرف رجحان ہو گیا اور بلآخر مرثیے ہی کو اپنا شغل حیات بنا لیا اور اس صنف سخن میں ایسا کمال پیدا کیا کہ اردو شاعری کے آسماں پر انیسؔ کا نام ایک تابندہ ستارے کی طرح ہمیشہ ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ انیسؔ کی تاریخ ولادت ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ ہے شہر فیض آباد کے محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے اور تاریخ وفات ۲۹ رشوال ۱۲۹۱ھ زیادہ مشہور ہے۔ بخار میں مبتلا ہو کر انتقال فرمایا اور اپنے مقبرہ واقع محلہ سبزی منڈی (چوک) لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ میر انیسؔ مرحوم نے تین فرزند چھوڑے جن میں سب سے بڑے میر خورشید علی نفیسؔ تھے۔ جو باپ کے جانشین ہوئے۔ میر نفیسؔ کے بعد ان کے فرزند سید خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروجؔ باپ کے جانشین ہوئے جنھوں نے اپنے دور مرثیہ گوئی میں مرثیہ گوئی سے زیادہ مرثیہ خوانی میں نام پیدا کیا ان کے انتقال کے بعد ان کے اکلوتے بیٹے سید محمد

حسن فائزؔ اپنے خاندان کا نام اپنے خاندانی فن سے روشن کرتے رہے۔لیکن فائزؔ مرحوم کے انتقال کے بعد اس خاندان سے مرثیہ گوئی کا سلسلہ ختم ہو گیا کیونکہ مرحوم نے لا ولد ہی وفات پائی میر نفیسؔ کے دوسرے بھائیوں کی اولاد اگر چہ باقی ہیں لیکن انقلاب زمانے کے باعث اپنے آبائی فن سے ان کا تعلق باقی نہ رہا۔

میر خلیقؔ کے ہم عصروں میں تین مشہور مرثیہ گو اور بھی تھے۔یعنی میر ضمیرؔ، میاں دلگیرؔ، اور مرزا فصیحؔ۔مگر میر خلیقؔ کا پایہ مرثیہ گوئی میں کسی سے نیچا نہ تھا اور مرثیہ خوانی میں سب سے اونچا تھا۔یہ جب مرثیہ پڑھتے تھے چشم و ابرو کے اشاروں سے اعضا کی مناسب حرکتوں سے اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے مضامین کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔میر خلیقؔ نے ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔

انسان کی سیرت جن چیزوں سے بنتی ہے ان میں اس کی تعلیم و تربیت اور اس کے مذہبی خیالات کا اثر سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے انیسؔ نے جس فضا میں تربیت پائی تھی اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ ایک نہایت متین، خوددار اور مہذب آدمی ہوں۔ان کے کمال نے ان طبعی خصوصیات سے مل کر ان کو نازک مزاج بنا دیا تھا۔ان کی نازک مزاجی اس وقت اور بڑھ جاتی تھی جب وہ مجلس عزا میں منبر پر بیٹھے ہوئے اپنا کلام اہل مجلس کو سنا رہے ہوں۔اس وقت ان پر ایک محویت کا عالم طاری ہوتا تھا۔اور وہ اپنے کمال کے نشے میں سرشار ہو کر اس بلندی پر پہنچ جاتے تھے جہاں سے بے کمالی کا درجہ خواب ریاست و امارت کا لباس ہی کیوں نہ پہنے ہوں بہت پست معلوم ہونے لگتا ہے۔

خودداری اور عزت نفس میر انیسؔ کی سیرت کے بہت نمایاں خصوصیات تھے۔لیکن یہ باتیں حد اعتدال سے گزر کر خود بینی اور بدمزاجی تک نہیں پہنچ گئیں تھیں بلکہ ان کی طبیعت کا

فطری میلان انکساری کی طرف تھا۔اور وہ خاکساری کو انسان کی ایک اعلیٰ صفت سمجھتے تھے ۔انہوں نے انکسار کی تعریف اور غرور کی مذمت نہایت مؤثر پیرائے میں کی ہے۔قانع اور متوکل آدمی تھے۔کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے تھے اور خدا کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہ کرتے تھے۔خدا نے انہیں جو جو نعمتیں عطا کی تھیں ان پر شکر بجالاتے تھے حق کہنے میں ذی اختیار اور صاحب دولت لوگوں سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوتے تھے اور خدا کے علاوہ کسی پر بھروسا نہ کرتے تھے۔قناعت اور استغنا کے متعلق انھوں نے ایسے ایسے پرزور شعر کہے ہیں کہ جن کی نظیر اردو شاعری میں ملنا مشکل ہے۔انیسؔ کے زمانے کے امراء نہایت خوشامد پسند تھے اور انیسؔ کا گزارا انہیں کی داد ودہش پر ہوتا تھا۔مگر وہ بھری مجلسوں میں انکے منھ پر قناعت اور اپنی خودداری وغیرہ کا ذکر نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اس شان سے کر دیتے تھے کہ ان کا بیان دعووں کی دلیل بن جاتا تھا۔ چنانچہ ان تمام مذکورہ باتوں کا ذکر میر انیسؔ نے اپنی اس رباعی میں کیا ہے:

دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں — یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں
لبریز ہیں یہ دولت استغنا سے — آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

ان تمام خصوصیات خودداری قناعت اور استغنا کا ذکر حسب ذیل بندوں میں حضرت مہذب لکھنوی نے کیا ہے۔

فقر میں رکھی صدا عزت و توقیر کمال — حسرتیں ہوگئیں دنیا میں ہزاروں پامال
لائے دل میں نہ کبھی شوکت وحشمت کا خیال — نہ کیا مدح سے دولت کا کبھی استقبال
جز حسینؑ ابن علیؑ غیر کی توصیف نہ کی
ہوگئی حد کہ شہنشاہ کی تعریف نہ کی

تھے نہ وہ صاحب دولت نہ زمانے کے امیر ان کی جانب جو بڑھی عزت وجاہ وجا گیر
تو نظر بھر کے نہ دیکھا طرف تاج وسریر کہہ دیا صاف کہ میں ہوں درِ سرورؑ کا فقیر
غیر کی مدح کروں شہؑ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

حسب ذیل دو بندوں میں میر انیسؔ نے لکھنؤ کی عزاداری اور وضع داری کا بہت حسن وخوبی سے ذکر کیا ہے جو ملاحظے کے قابل ہے:

مجلس کا انتظام اسی شہر پر ہے ختم رونے کا اہتمام اسی شہر پر ہے ختم
یہ آبرو یہ نام اسی شہر پر ہے ختم بس ماتم امام اسی شہر پر ہے ختم
پوچھو جو پھر کے آئے ہیں یاں ہر دیار میں
دیکھا نہ ہوگا ایک گل ایسا ہزار میں

ہر دل ہے عندلیب گلستان لکھنو گلزار مومنیں ہے زہے شان لکھنؤ
نعرے علیؑ علیؑ کے ہیں قربان لکھنو رضواں بھی ہے ارم میں ثنا خوان لکھنؤ
پوچھو جو پھر کے آئے ہیں یاں ہر دیار میں
دیکھو کہ اس خزاں پہ بھی اپنے بہار ہے

غالب کی غزل گوئی

مرزا اسد اللہ خاں کا تخلص : غالب کا پورا نام مرزا اسد اللہ خاں تھا مرزا نوشہ آپ کی عرفیت ہے ابتداء میں اسدؔ تخلص تھا۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا
یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بعد میں غالب رکھا اور اسی تخلص سے مشہور ہیں ۔ ۱۷۹۵ء میں مقام آگرہ پیدا ہوئے۔ باپ کا نام عبداللہ بیگ خاں تھا۔ آگرے سے دہلی آئے اور یہیں کے ہو رہے انہیں اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اور بجا ناز تھا۔ اردو میں بھی مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں۔ اردو مراسلات کو مکالمے کا جامہ پہنایا۔ مرزا اردو میں شعر کہنا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اصل جولانی طبع فارسی میں دکھلاتے تھے۔ لیکن کیا خبر تھی کہ یہی نامرغوب چیز ان کی شہرت کا باعث ہوگی ۔ اردو کے ابتدائی اشعار معلق اور عام فہم سے بالاتر ہوتے تھے لیکن دوستوں کی نکتہ چینی اور چھیڑ چھاڑ سے ایسے سنبھلے کہ اردو کا کلام جذبات انسانی کا بہترین مرقع ہو گیا۔ حالات کی جدت ، مضمون کی بلند پروازی اپنی مثال آپ ہے ۔ عامیانہ اور مبتذل تشبیہوں سے کلام پاک ہے۔ متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور ظرافت سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ شعر میں جان

آجاتی ہے۔ ۷۳ برس کی عمر پا کر ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں دنیا سے انتقال کیا۔ آہ غالب بمرد تاریخ انتقال ہے۔ شریف الحسن عثمانی نے غالب کے خطوط سے ان کے حالات زندگی لکھیں ہیں۔ جو غالب صدی ۱۹۶۹ء کے موقع پر مختلف اخباروں رسائل میں شائع کئے جا چکے ہیں۔ اس مضمون کا عنوان ہی غالبؔ کی کہانی غالبؔ کی زبانی، ذیل میں اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

''میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں میں نے ایام دبستاں نشینی میں شرح مائتہ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو ولعب اور آگے بڑھ کر فسق وفجور عیش وعشرت میں منہمک ہوگیا میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماورالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا سلطنت ضعیف ہوگئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نقارے نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر ذات کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبیدار تھا اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جنرل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبیدار کمشنری ہوگئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا صاحب کو جنرل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا بریگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار ذات کا لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا ملک برطرف ہوگیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہوگئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں پانچ برس کا تھا باپ مر گیا نو برس کا تھا کہ چچا مر گیا۔

نوابی کا خطاب ہے۔ نجم الدولہ اور اطراف جنوب کے امراء مجھ کو نواب کہتے ہیں ۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں ۔ انبیاء واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت کے سب مفترض الطاعتہ تھے محمدؐ علیہ اسلام پر نبوت ختم ہوئی یہ خاتم المرسلین اور رحمت اللعالمین ہیں مقطع نبوت کا مطلع امامت کا اور امامت نہ اجتمائی بلکہ من اللہ ہے ۔ اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام زیستم ہم بریں بگرام۔

ہاں اتنی بات اور ہے کہ۔۔۔ زندقہ مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں اگر مجھکو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تا کہ منکرین ومشرکین نبوت مصطفویؐ اور امامت مرتضوی اس میں جلیں ۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے پاس حکم دوام حبس جاری ہوا۔ ایک بیڑی پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ اللہ اللہ ایک وہ کہ دو بار انکی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ کچھ اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے اور نہ تو دم نکلتا ہے۔

میں لم یلد ولم یولد ہوں ۔ ۶۷ برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے ۔ لڑکے اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔

چچا کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش دس ہزار روپیہ سالانہ اس میں میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال ۔ بادشاہ دلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کر دیا ان کے ولی عہد نے چار سو روپیہ سال ۔ ولی عہد تقرر کے دو برس بعد مر گئے ۔ واجد علی بادشاہ اودھ کی سرکار سے یہ صلہ مدح گستری پانچ سو روپیہ سال مقرر ہوئے ۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے یعنی اگر چہ اب تک جیتے ہیں مگر

سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو برس میں ہوئی ۔ دلی کی سلطنت سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دیکر بگڑی ۔ ایسے طالعے مربی کش، محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں ۔نواب یوسف علی خاں بہادر والی ریاست رام پور رئیس ۲۵ برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگردہیں ۔آگے گاہ گاہ کبھی کچھ بھیج دیا کرتے تھے ۔اب جولائی ۱۸۵۹ء سے ماہ بماہ ۵۵/روپئے بھیجتے ہیں ۔

مولانا غالب علیہ الرحمہ ان دنوں بہت خوش ہیں پچاس ساٹھ جز کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی بوستان خیال آگئی ۔ ۱۷/ بوتلیں بعدۂ ناب کی توشہ خانہ میں موجودہیں دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں ۔

کسے کیں مرادش میسر بود
اگرہم نباشد سکندر بود

۱۸۵۸ء میں بیمار کیا ہوا توقع زیست کی نہ رہی قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ بسمل کی طرح تڑپا کیا۔عصارۂ ریونداور ارنڈی کا تیل پیا۔اس وقت تو بچ گیا مگر قصہ تمام نہ ہوا دس دن میں دو بار آدھی آدھی غزا کھائی گو یا دس برس میں ایک بار غذا تناول فرمائی گلاب اور املی کا پنّا اور آلو بخارے کا افشردہ اس پر مدار رہا۔کل سے خوف مرگ گیا اور صورت زیست کی نظر آئی میں اب انتہائی عمر ناپائدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی وآرام روحانی سے زندہ درگور ہوں ۔کچھ یاد خدا بھی چاہئے ۔نظم ونثر کا قلمرو کا انتظام ایزد توانا کی عنایت واعانت سے خوب ہو چکا۔اگراس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی وقائم رہے گا۔

کوبکم رادرعدم اوج قبول بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

لکھنؤ

ایک مشہور و معروف شہر کا نام

رضواں بھی ہے ارم میں ثنا خوان لکھنوٴ
نعرے علیؑ علیؑ کے ہیں قربان لکھنوٴ
چہلم کے بعد سوگ کے کپڑے اترتے ہیں
جیتے رہیں یہ لوگ جو رونے پہ مرتے ہیں
(انیسؔ)

گزشتہ لکھنوٴ، میں عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ ٹھیک کسی کو نہیں معلوم کہ لکھنوٴ کی آبادی کی بنیاد کب پڑی۔ اس کا بانی کون تھا؟ اور وجہ تسمیہ کیا ہے؟ لیکن مختلف خاندانوں کی قومی روایتوں اور قیاسات سے کام لے کر جو کچھ بتایا جا سکتا ہے یہ ہے؟

کہتے ہیں راجہ رام چندر جی لنکا کو فتح کر کے اور اپنے بنواس کا زمانہ پورا کر کے جب سریر جہاں پناہی پر جلوہ افروز ہوئے تو یہ سرزمین انھوں نے جاگیر کے طور پر اپنے ہمسفر ہم درد بھائی لچھمن جی کو عطا کر دی۔ چنانچہ انہیں کے قیام یا ورود سے یہاں دریا کنارے ایک اونچے ٹیکرے پر ایک بستی آباد ہوگئی جس کا نام اس وقت سے لچھمن پور قرار پایا اور وہ ٹیکرا لچھمن ٹیلا مشہور ہوا۔ اس ٹیلے میں ایک بہت گہرا غار یا کنواں تھا جس کی کسی کو تھاہ نہ

ملتی تھی اور لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ سیس ناگ (ہندو دیومالا میں سیس ناگ اس ہزار سروالے سانپ کا نام ہے جو دھرتی وزمین کو اپنے پھن پر اٹھائے ہوئے ہے اور قدرت وعظمت الٰہی کا ایک واجب الاحترام مظہر ہے) تک چلا گیا ہے۔ اس خیال نے جذبات عقیدت کو حرکت دی اور ہندو لوگ خوش اعتقادی سے جا جا کے اس میں پھول پانی ڈالنے لگے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ جودھشتر کے پوتے، راجا جنم جے نے یہ علاقہ، مرتاض بزرگوں رشیوں اور منیوں کو جاگیر میں دیا تھا۔ جنہوں نے یہاں چپے چپے پر اپنے آشرم بنائے اور ہر کے دھیان میں مصروف ہو گئے ایک مدت کے بعد ان کو کمزور دیکھ کے دو نئی قومیں ہمالیہ کی ترائی سے آ کے اس ملک پر قابض ہو گئیں جو ملتی جلتی اور ایک ہی نسل کی دو شاخیں معلوم ہوتی تھیں ایک بھرا اور دوی پانسی۔

انہیں لوگوں سے سید سالار مسعود غازی سے ۵۹ھ محمدی (۱۰۳۰ء) میں مقابلہ ہوا اور غالباً انہیں پر بختیار خلجی نے ۶۲۱ھ محمدی (۱۲۰۲ء) میں چڑھائی کی تھی۔ لہٰذا اس سرزمین پر جو مسلمان خاندان پہلے پہل آباد ہوئے وہ انہیں دونوں حملہ آوروں خصوصاً سید سالار مسعود غازی کے ساتھ آنے والوں میں سے تھے۔

بھر اور پانسیوں کے علاوہ برہمن اور کائستھ بھی یہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان لوگوں نے مل کر یہاں ایک چھوٹا سا شہر بسا لیا اور امن وامان سے رہنے لگے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بستی کا نام لچھمن پور سے بدل کر لکھنؤ کب ہو گیا۔ اس آخری مروجہ نام کا پتہ شہنشاہ اکبر سے پہلے نہیں چلتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو و مسلمانوں کی کافی آبادی موجود تھی۔ جس کا ثبوت اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو شیوخ لکھنؤ کی خاندانی روایتوں میں بہت پہلے سے موجود ہے کہ ۹۴۹ھ محمدی ۱۵۴۰ء میں جب ہمایوں بادشاہ کو شیر شاہ کے مقابل

جونپور میں شکست ہوئی تو وہ میدان چھوڑ کے سلطانپور، لکھنؤ، پیلی بھیت ہوتا ہوا بھاگا لکھنؤ میں اس نے صرف چار گھنٹے دم لیا تھا اور گو کہ شکست کھا کے آیا تھا اور کوئی قوت وحکومت نہ رکھتا تھا مگر لکھنؤ کے لوگوں نے محض انسانی ہمدردی اور مہماں نوازی کے خیال سے ان چند گھنٹوں ہی میں دس ہزار روپیہ اور پچاس گھوڑے اس کو نذر کئے تھے۔ اتنے تھوڑے زمانے میں اس سامان کے فراہم ہو جانے سے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان دنوں یہاں معتد بہ آبادی موجود تھی اور ان دنوں کا لکھنؤ آج کل کے اکثر قصبات سے زیادہ با رونق اور خوشحال تھا ۔ ۱۰۱۹ھ ہجری ۱۵۹۰ء شہنشاہ اکبر نے جب سارے ہندوستان کو بارہ صوبوں میں تقسیم، کیا تو صوبہ اودھ کے صوبیدار یا والی کا مستقر بادی النظر میں لکھنؤ ہی قرار پایا تھا۔ ان دنوں اتفاق سے شیخ عبدالرحیم نام ضلع بجنور کے خستہ حال و پریشان روزگار بزرگ با تلاش معاش دہلی پہنچے وہاں امرائے دربار سے رسوخ پیدا کر کے بارگاہ شہنشاہی میں باریاب ہوئے ۔ آخر منصب داران شاہی میں شامل ہو کے لکھنؤ میں جاگیر پائی اور چند روز بعد بڑے تزک و احتشام اور کروفر سے اپنی جاگیر میں آ کے مقیم ہوئے یہاں خاص لچھمن ٹیلے یا شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر مقیم ہو کے انہوں نے اپنا پنچ محلہ بنوایا شیخن دروازہ تعمیر کرایا۔ اور لکھنؤ ہی میں پیوند زمین ہوئے ان کا مقبرہ نادان محل کے نام سے آج تک مشہور ہے۔

اسی زمانے میں یہاں شیخ عبدالرحیم نے لچھمن ٹیلے کے پاس ایک دوسری بلندی پر ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کرایا جو قرب وجوار کی گڑھیوں سے زیادہ مضبوط تھا اور گرد ونواح کے لوگوں پر اس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ یا تو اس لئے کہ شیخ عبدالرحیم کو دربار شاہی سے علم ماہی مراتب عطا ہوا تھا یا اس لئے کہ قلعے کے ایک مکان میں چھبیس (۲۶) مہرابیں تھیں اور ہر مہراب پر معمار نے دو دو مچھلیاں بنا کے باون (۵۲) مچھلیاں بنا دیں تھیں۔ اس قلعہ کا نام مچھی بھون مشہور ہو گیا

۔بھون کا لفظ یا تو قلعہ کے معنوں میں ہے یا باون کے لفظ سے بگڑ کر بن گیا ہے۔جس معمار نے اس قلعہ کو تعمیر کیا وہ لکھنا نام کا اہیر تھا اور کہتے ہیں کہ اس کے نام سے شہر کا نام لکھنؤ ہو گیا ۔اور بعض کا خیال ہے کہ لچھمن پور ہی بگڑ کے لکھنؤ بن گیا ہے۔ چند روز بعد شیخ عبدالرحیم کے خاندان والوں یعنی شیخ زادوں کے علاوہ یہاں پٹھانوں کا ایک گروہ آ گیا جو جنوب کی طرف بسے اور رام نگر کے پٹھان مشہور ہوئے۔انہوں نے اپنی زمینداری کی حد اس مقام تک قرار دی تھی جہاں اب گول دروازہ واقع ہے۔

اکبر ہی کے زمانے میں لکھنؤ ترقی کرنے لگا تھا اور اس کی آبادی بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھی۔اکبر کو لکھنؤ کی طرف توجہ تھی چنانچہ اس نے یہاں کے برہمنوں کو باجپئی چڑھاوے کے لئے ایک لاکھ روپۓ مرحمت فرمائے تھے۔اور اسی وقت سے لکھنؤ کے باجپئی برہمن مشہور ہوئے اسی سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم ترین ہندو محلے جو اکبر کے وقت میں موجود تھے باجپئی ٹولہ، کٹاری ٹولہ،سوندھی ٹولہ، بنجاری ٹولہ، اور اہیری ٹولہ ہیں یہ سب چوک ہی کے اطراف میں ہیں۔

مرزا سلیم نے جو تخت پر بیٹھ کے نورالدین جہانگیر کے لقب سے مشہور ہوئے، باپ کی زندگی اور اپنے ایام ولی عہدی میں مرزا منڈی کی بنیاد ڈالی جو مچھی بھون سے مغرب کی طرف واقع ہے۔اکبر کے آخر عہد میں یہاں کے صوبے دار جواہر خاں تھے وہ تو دہلی میں رہتے تھے مگر ان کے نائب قاضی محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب میں اس سے ملے ہوئے داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کئے اور ان کے اور چوک کے درمیان میں بادشاہ کے نام سے اکبری دروازہ تعمیر کرایا۔

یورپین سیاح لیکٹ جو ۱۶۳۱ء یعنی شاہ جہاں بادشاہ کی سلطنت کے اوائل میں

ہندوستان کی سیر کر رہا تھا۔ لکھنؤ کی نسبت لکھتا ہے کہ ''یہ عظیم الشان منڈی ہے۔'' عہد شاہجہانی میں یہاں کے صوبہ دار سلطان علی شاہ قلی خاں تھے ان کے دو بیٹے مرزا فاضل اور مرزا منصور انہیں دونوں کے نام سے انہوں نے محمود نگر سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کے دو نئے محلے فاضل نگر اور منصور نگر آباد کئے۔

اس زمانے میں اشرف علی خاں نام ایک رسالدار تھے انہوں نے اسی سلسلے میں اشرف آباد بسایا۔ اوران کے بھائی مشرف علی خاں

نے نالے کے دوسری طرف اپنا گھر بنا کے مشرف آباد نام ایک اور محلہ قائم کیا جس کا نام مرور ایام سے اب نوبستہ ہو گیا۔ انہیں دنوں پیر خاں نام ایک فوجی افسر تھے جنہوں نے ان سب محلوں سے مغرب کی طرف دور جا کے اپنی گڑھی بنائی جو مقام (کذا) آج تک پیر خاں کی گڑھی کہلاتا ہے۔

شہنشاہ اورنگزیب عالم گیر نے کسی ضرورت سے اجودھیا کا سفر کیا تھا واپسی کے وقت لکھنؤ میں ٹھہرتا ہوا دہلی گیا اس موقع پر اس نے شاہ پیر محمد کی ٹیلے والی مسجد تعمیر کرائی جو خاص لچھمن ٹیلے پر ہونے کی وجہ سے ایسی بلندی پر واقع ہے جس سے زیادہ مناسب جگہ مسجد کے لئے لکھنؤ میں نہیں ہو سکتی اور غالباً اسی موقع پر اس نے فرنگی محل کے مکانات علامہ زماں ملا نظام الدین کی نذر کئے ہوں گے۔

لکھنؤ کی یہ حالت تھی کہ ۱۱۶۱ھ محمدی ۱۷۳۲ء میں نواب سعادت خاں برہان الملک دربار دہلی سے اودھ کے صوبے دار مقرر ہو کے آئے جن سے ہندوستان کے اس آخری مشرقی دربار کی بنیاد پڑی جس کے عروج کو ہم مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دیکے بیان کرنا چاہتے ہیں۔

نواب سعادت خاں برہان الملک کے خاندان کے متعلق اسی قدر بتا دینا کافی ہے

کہ میر محمد نصیر نام نیشاپور کے ایک سید زادے جن کا سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظمؑ سے ملتا ہے سنہ ۱۱۳۵ محمدی سنہ ۱۷۰۶ء عہد بہادر شاہ میں وارد ہندوستان ہوئے ان کے بیٹے میر محمد باقر ساتھ ساتھ آئے تھے۔ جنہوں نے یہاں شادی کر لی اور باپ بیٹوں نے ناظم بنگالہ کی زیر حمایت عظیم آباد پٹنہ میں سکونت اختیار کی۔ محمد باقر کو ہندوستان کی بی بی سے خدا نے ایک بیٹا دیا جو بعد کو شیر جنگ کے معزز لقب سے مشہور ہوا۔ میر محمد نصیر کے آنے کے دو سال بعد ان کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین بھی نیشاپور سے ہندوستان آ گئے۔ عظیم آباد پہنچے تو سنا کہ والد نے سفر آخرت کیا اور اب دونوں بھائی میر محمد باقر اور میر محمد امین دہلی کو روانہ ہوئے جہاں پہنچ کے میر محمد امین کو شہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکا مل گیا اس میں انہوں نے ایسی لیاقت، مستعدی، اور کار گزاری دکھائی کہ تمام لوگوں میں شہرت ہو گئی۔ چند ہی روز بعد دربار شاہی کے معزز امیروں اور منصب داروں میں شامل ہوئے۔ پھر صوبے دار اکبر آبادی کی بیٹی سے نکاح ہو گیا اور اس اعلیٰ طبقۂ امراء میں شمار کئے جانے لگے۔ جس پر سلطنت کی ذمہ داری کی خدمتوں کے لئے انتخاب کی نظریں پڑتی تھیں۔ ان دنوں دہلی میں سادات بارہہ کا زور تھا جس سے رعیت و رعیت خود بادشاہ سلامت ڈرتے تھے۔ محمد امین نے ان کو قتل کرا کے سیدوں کا زور ہمیشہ کے لئے توڑ دیا اور لڑائی میں ایسی شجاعت دکھائی کہ دربار شاہی سے منصب ہفت ہزاری اور سات ہزار سواروں کی سرداری کے ساتھ برہان الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا ہوا اور اسی وقت اکبر آباد کے صوبے دار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد بادشاہی داروغگی عطا ہوئی جو بڑا معزز عہدہ تھا اس کے تھوڑے دنوں بعد وہ صوبۂ اودھ کے صوبے دار اور اس کے ساتھ ہی بادشاہی توپ خانے کے داروغہ مقرر ہوئے۔ آدمی ہوشیار اور نہایت بیدار مغز اور اس کے ساتھ بڑے بہادر اور شجاع تھے۔ شاہی توپ خانے کو اپنے ہاتھ میں لے کے انہوں نے

ایسی زبردست قوت پیدا کرلی جیسی ان دنوں سارے ہندوستان کو نصیب نہ تھی اس زمانے میں کوڑا کے زمیندار بھگون سنگھ نے سلطنت کی سرتابی کر کے بڑا زور باندھ رکھا تھا اور کئی افسر جو اس کی سرکوبی کو گئے اس کے ہاتھ سے مارے جا چکے تھے۔ آخر برہانالملک اس مہم پر مامور ہوئے اور یلغار کرتے ہوئے پہنچے۔ بلونت سنگھ نے انہیں چالاکی سے گھیر لیا اور لڑائی کا رنگ ایسا بگڑا نظر آیا کہ بڑے بڑے بہادروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے مگر برہان الملک نے ایسی جواں مردی سے مقابلہ کیا کہ دیر تک دشمنوں کے نرغے میں ان کی لمبی، سفید، نورانی داڑھی چمکتی اور رعب ڈالتی رہی۔ تھوڑی دیر میں بھگونت سنگھ ان کے تیر کا نشانہ ہوا اور دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔

برہان الملک کی دوسری مہم اس سے بھی زبردست تھی ۔ان دنوں مرہٹوں کا ہندوستان میں بڑا زور تھا۔ انہوں نے تاج دار دہلی سے چوتھ مقرر کرا لی تھی اور بڑے بڑے سورماں ان کے نام سے کانپتے تھے۔ برہان الملک نے مرہٹوں کو زبردست فوج کے ساتھ جا کے ایسی شکست سخت دی کہ ان کے حواس جاتے رہے۔ نوک دم بھاگے اور برہان الملک نے تعاقب شروع کیا واقعات تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس موقعے پر برہان الملک زبردستی نہ روک دئے جاتے تو وہ بڑھ کے مرہٹوں کا استیصال کر دیتے اور سلطنت مغلیہ اپنے اگلے عہد شباب کی طرح سارے ہندوستان کی سیاہ وسفید کی مالک ہو جاتی مگر اس بدنصیب زوال پزیر سلطنت کو مٹنا ہی تھا درباریوں کی سازش اور مقربین دربار کی حسد نے برہان الملک کی رفتار کو روک دیا۔ اس بات نے برہان الملک کو یقین دلا دیا کہ بادشاہ میں اپنے نیک و بد کی سوچنے کی صلاحیت نہیں اور اہل دربار بد دیانت وخود غرض ہیں۔ فوراً مرہٹوں سے صلح کر لی پھر ارادہ کیا کہ اپنے صوبے میں جا کے قیام کریں۔ غرض برہان الملک نے دل

میں سمجھ لیا کہ اب سلطنت مغلیہ پنپنے والی نہیں ہے اپنا صوبہ لے کے الگ ہو جانا ہی مناسب ہے اور دربار دہلی کو اس کی قسمت پر چھوڑ دینا چاہئے۔

لکھنؤ میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ شیخ زادوں کا زور تھا۔انہیں نے اپنی عادت کے موافق انہیں بھی روکا مگر برہان الملک حکمت عملی سے داخل ہو گئے اور نکسیر بھی نہ پھوٹنے پائی برہان الملک کے لکھنؤ میں داخل ہونے کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ایک یہ کہ وہ برابر بڑھتے چلے آئے یہاں تک کہ اکبری دروازے پر روکے گئے چونکہ وہ سابق تھے کہ وہ تمام صوبے داروں کے خلاف تجربے کار، متین ،اور سنجیدہ شخص تھے ٹھہر گئے اور محمود نگر میں پڑاؤ ڈال دیا۔دو ایک دن کے بعد شیخ زادوں کی دعوت کی ان سے بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے۔لیکن جس وقت غافل شیخ زادے الوان نعمت کا مزا لوٹنے میں مصروف تھے شاہی فوج خاموشی کے ساتھ چوک میں داخل ہو رہی تھی جو برابر بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ مچھی بھون کے پاس پہنچی۔

جب مچھی بھون پر قبضہ ہو گیا تو پھر کون دم مار سکتا تھا شیخ زادوں کے تمام معزز لوگوں نے حاضر ہو کے عاجزی سے سر جھکا دیا۔برہان الملک ہاتھی پر سوار ہو کے شیخن دروازے میں داخل ہوئے اور اس تلوار کو جو بڑے بڑے بہادروں سے سلام لے چکی تھی۔اپنی تلوار سے کاٹ کے گرا دیا۔

اس کے بعد برہان الملک اجودھیا گئے اور دریا کنارے وہ بنگلہ بنوایا جس کا حال ہم بیان کر چکے ہیں لیکن وقتاً فوقتاً لکھنؤ میں آئے اور قیام کرتے تھے۔کیوں کہ صوبے کا مستقر یہی شہر تھا ان کے زمانے میں یہاں کئی محلے آباد ہوئے مگر یہ محلے سب انکے مغل سرداران فوج کے پڑاؤ کے مقامات تھے۔جہاں مستقل سکونت کے لئے لوگوں نے مکان

بنانا شروع کر دئے۔خدا یار خاں کا کٹرا، سید حسین خان کا کٹرا، ابوتراب خاں کا کٹرا، بزن بیگ خاں کا کٹرا، محمد علی خاں کا کٹرا، باغ مہا نارائن کا کٹرا، سرائے مالی خاں، اور اسماعیل گنج جو مچھی بھون کے مشرق کی طرف تھا اب کھد گیا سب اسی زمانے کے محلے یا برہان الملک کے سرداران فوج کی لشکر گاہیں ہیں۔

نواب برہان الملک چھ ہی برس اودھ اور لکھنؤ میں رہنے پائے تھے کہ ۱۱۶۷ھ محمدی یا ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اور وہ نہایت تاکید کے ساتھ دہلی میں بلائے گئے۔اس پُرفتن زمانے میں جو کچھ واقعات گزرے ان کو لکھنؤ سے تعلق نہیں لکھنؤ میں اپنا نائب اور قائم مقام بنا کے وہ اپنے بھانجے اور داماد صفدر جنگ کو چھوڑ گئے تھے۔نادر دہلی کو لوٹ چکا تھا اور قتل عام کرا چکا تھا مگر ابھی وہیں تھا کہ نواب برہان الملک نے دہلی میں وفات پائی۔ان کے بھتیجے شیر جنگ نے نادر شاہ سے سفارش اٹھوائی کہ نواب مرحوم کے بعد اودھ کی صوبے داری انہیں دی جائے۔لیکن راجہ لچھمی نارائن نے جو برہان الملک کے معتمد عہدے داروں میں تھا نادر شاہ کی خدمت میں اس مضمون کی ایک عرضداشت پیش کر دی ''نواب برہان الملک شیر جنگ سے خوش نہ تھے اور اسی لئے انہوں نے اپنی بیٹی ان کو چھوڑ کر صفدر جنگ کو دی جو انکی نیابت کرتے تھے اور اس وقت بھی ان کی طرف وہاں موجود ہیں برہان الملک کے مال واسباب کی مالک سرکار ہے جسے چاہے عطا کرے اس لئے کہ کوئی ورثہ نہیں ہے یہ بھی عرض ہے کہ صفدر جنگ بردبار، خداترس، لائق اور وعدے کے سچے ہیں اور سپاہ ان سے خوش ہے قطع نظر اس کے حضور کے لئے برہان الملک نے دو کروڑ کی رقم کا وعدہ کیا تھا اس کے ادا کرنے کا انتظام نواب صفدر جنگ نے کر لیا ہے جس وقت حکم ہو حاضر کئے جائیں ان وجوہ سے امید ہے کہ حضور انہیں کی سفارش فرمائیں گے یہ عرض داشت دیکھتے ہی

نادرشاہ نے صفدر جنگ کے لئے محمد شاہ سے خود ہی خلعت صوبے داری لے لیا اور اپنے ایک مصاحب اور دوسو سواروں کے ساتھ اودھ میں صفدر جنگ کے پاس بھیجا۔ یوں خلعت صوبے داری پہن کر صفدر جنگ نے وہ دو کروڑ کا نذرانہ نادر کے پاس بھجوا دیا اور اپنے علاقے پر حکومت کرنے لگے۔

رشیدؔ کی غزل گوئی

رشیدؔ کا انداز غزل بالکل سادہ تھا۔ دقیق اور فرسودہ مضامین کو غزل میں جگہ نہیں دی ۔انداز بیان نہایت دلکش و دلنشیں تھا۔ غزل میں جاذبیت لگاؤ اور دلربائی تھی یہ شعر کیسا لاجواب ہے۔ یہ شعر جب پڑھے جب سنے تعریف کے کلمات زبان پر لائے کس خوبی اور تہذیب کو مدنظر رکھ کے کہا ہے۔

حوض کوثر خود چھلک کے پاؤں پر گرنے لگے
گر ہنسی سے آپ کہہ دیں ہم نہانے آئیں ہیں

مہذب لکھنوی اپنی تالیف کردہ مہذب اللغات جلد ہشتم میں رشیدؔ کے حالات زندگی کے تحت تحریر کرتے ہیں کہ ''رشید کی زبان مرثیہ وغزل دونوں میں نہایت سلیس وسادہ اور نرم وشیریں ہے۔ دقیق الفاظ ناموس وغریب فارسی تراکیب وتوالئی اضافتوں سے کلام بالکل پاک ہے۔ (مہذب اللغات مؤلفہ مہذب لکھنوی جلد ششم صفحہ ۳۶)

خواجہ رؤف عشرت تذکرۂ آب بقا میں اس طرح تحریر کرتے ہیں کہ ''جناب رشیدؔ تعلیم فارسی سے فارغ ہوتے ہی شاعری کے زمرے میں داخل ہو گئے ان کا رنگ تغزل بہت اچھا تھا۔ اکثر رؤساء اور امراء کے مشاعروں میں بھی آپ شریک ہوا کیے ہیں۔

عشقؔ وتعشقؔ کے بعد رشیدؔ کی شاعری نے شہرت حاصل کی غزل کی مشق بہت چڑھی ہوئی تھی ۔آپ صاحب دیوان ہیں ۱۹۵۱ء میں گلستان رشید کے نام سے آپ کے

غزلیات حضرت مہذب نے طبع کر دیے ہیں۔
بعض شعراء دہلی و لکھنؤ نے سینے کی تعریف کی ہے مگر بہت ہی بھونڈے اور مہمل انداز میں۔

چہرہ دکھلایا ہے جو بن بھی دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

اس شعر میں قدر غنیمت انداز ہے:

چلئے ذرا چمن میں نہ سینہ اُبھار کے
باد صبا لگائے گی چوری انار کی

رشیدؔ نے بھی سینے کی تعریف کی ہے لیکن جو حسن و خوبی اور مہذبانہ انداز اختیار کیا ہے اس کا جواب نہیں ہے۔

جوانی سے تکلف بڑھ گیا ہے میرے ساقی کا
شراب کہنہ آئی ہے نئے ساغر نکلتے ہیں

اس شعر میں بھی سینے کی طرف بہت لطیف اشارہ ہے:

نمو کی فصل جوانی کی آمد آمد ہے
کہ جا بجا سے مسکنے لگی قبا ان کی

حسب ذیل اشعار قابل دید ہیں:

مار ڈالے گی ہمیں یہ خوش بیانی آپ کی
موت کا پیغام آئے گا زبانی آپ کی
زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہے
مہربانی آپ کی نا مہربانی آپ کی

محبوب کے سینوں کی طرف بہت ہی لطیف اشارہ ہے:

بڑھ چکا قد بھی فروغ حسن کی حد ہو چکی
اب تو قابل دیکھنے کے ہے جوانی آپ کی
آپ سے مل کے گلے راحت سے آجاتی ہے نیند
سبزۂ خوابیدہ ہے پوشاک دھانی آپ کی
رنگ عالم کا بدلنا آپ کے صدقے میں ہے
جمع کر رکھی تھیں پوشاکیں پرانی آپ کی
جب وہ مجھ کو دیکھتا ہے ہنس کے کہتا ہے رشیدؔ
کتنی پابند وفا ہے زندگانی آپ کی

(گلستان رشیدؔ مرتبہ مہذب لکھنوی صفحہ ۱۰۷)

رشیدؔ کو قدرت نے ہمہ صفت بنایا تھا جب غزل کہتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل کے مزاج میں ایسا رچ بس جاتے ہیں کہ یہ صرف غزل کہنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔غزل میں سنجیدہ موضوعات کے برعکس حسن و عشق کی حسین وادیوں میں گم ہوتے زیادہ نظر آتے ہیں۔انہوں نے غزل میں عجیب پر کیف و پر سرور مضامین بہت خوبصورت انداز میں پیش کئے ہیں اور اپنے استاد تعشقؔ کا رنگ ان کی غزلوں میں زیادہ نظر آتا ہے۔اس مطلع میں لطف بیانی ملاحظہ ہو:

وہ محو ناز ہیں دم بھر کو آنہیں سکتے
ہم انتظار میں دنیا سے جا نہیں سکتے

حسن مطلع بھی ویسا ہی زوردار ہے:

ضعیف در پہ ترے ظلم اٹھا نہیں سکتے
جو قصد جانے کا کرتے ہیں جا نہیں سکتے

قدیم رنگ کا شعر ہے جو اُس دور کا پسندیدہ انداز تھا:۔

ہماری لاش پہ اتریں گی بیڑیاں اور طوق
ابھی سے وہ کوئی منت بڑھا نہیں سکتے
لحد پہ فاتحہ بھی چپکے چپکے پڑھتے ہیں
میں جی اٹھوں گا صدا وہ سنا نہیں سکتے
خیال ہے کہ وہ اٹھ جائیں گے خفا ہو کر
قریب مرگ بھی آنکھیں پھرا نہیں سکتے
یہ قتل گہہ میں صدا ہے تمہارے کشتوں کی
مٹادیا ہمیں تم نے بنا نہیں سکتے
کمال پاس ادب ہے جو داغ سودا کا
رشیدؔ خاک بھی سر پر اڑا نہیں سکتے

(گلستان رشیدؔ مرتبہ مہذب لکھنوی صفحہ ١١٤۔١١٥)

سزا ہر ایک کو دینے لگی حیا ان کی
کہ چاک ہو گئی لپٹی جہاں قبا ان کی
بہت غرور ہے عادت نہیں تواضع کی
جھکائے دیتی ہے لیکن انہیں حیا ان کی

ایک دوسری غزل کا شعر ہے:

کشتہ ٔ لاغر کو اپنے دفن کر دیجئے فقط
غسل میت ہو چکا آب دم شمشیر سے
نزع میں پاؤں ہیں میرے کوئے جاناں کی طرف
چاہتا ہوں واں پہنچ جاؤں کسی تدبیر سے

ایک اور غزل کے دو شعر:

کلمہ حق اب تو لازم اے بت پیر ہے
رکھ چکا ہے حلق پر خنجر دم تکبیر ہے
وہ اسیر حسن ہیں اور ہم اسیر عشق ہیں
واں گلے میں طوق ہے یاں پاؤں میں زنجیر ہے

رشیدؔ کی رباعیات:

مرزا جعفر علی خاں اثرؔ گلستان رشید کی تقریظ میں لکھتے ہیں کہ ''پیری مضامین تو گویا حضرت رشیدؔ کا حصہ ہو گئے ایک معمولی موضوع میں اتنی اور اس قدر تنوع طرفگی پیدا کر دینا حیرت انگیز ہے۔

رباعیات رشید ان کے دور میں بہت مقبول ہوئے اور ان کے ہم عصر مرثیہ گویوں میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی، جس طرح مرثیہ گو کی حیثیت سے شہرت حاصل کی اسی طرح رباعی گوئی میں بھی ممتاز ہوئے۔

انیس کی طرح ان کو بھی خاص درجہ حاصل ہے خاص طور سے پیری کی رباعیات بہت مقبول ہوئیں اور اس وقت بھی لوگوں کی زبان زد ہیں۔

رشیدؔ کی رباعیوں کے بارے میں مرزا فدا علی خنجر لکھتے ہیں:

’’رشید کی رباعیاں دیکھنے کو حکیم یا مورّخ، مفسر یا فقیہ، ریاضی داں یا مہندس کی نظر نہیں چاہئے کیوں کہ انہیں اس گروہ سے علاقہ نہ تھا۔ وہ صرف شاعر تھے اور بطن مادر سے شاعرانہ دل و دماغ اور ذہن رسا لیکر آئے تھے اور علوم مروجہ کی مہارت نے اس پر صیقل کر کے اور بھی چمکا دیا تھا۔‘‘

رشیدؔ نے رباعیات میں ثقیل الفاظ گراں تراکیب سے احتراز کیا ہے۔ بلکہ بہت سادہ اور شیریں انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ رباعیوں میں اخلاقی، سماجی، مذہبی، عبرت آموز اور اپنے ممدوح سے عقیدت مندانہ جذبے کا اظہار کیا ہے۔ خاص طور سے پیری سے متعلق جو رباعیاں کہی ہیں ان میں زندگی کے تلخ تجربہ، مختلف قسم کے تجربات بہت ہی لطیف اور بہت شیریں انداز میں بیان کئے ہیں۔ پیری سے متعلق چند رباعیاں پیش ہیں:

پیری وہ ہے کہ جس کا مارا ہوں میں
اے بھائیوں مہمان تمہارا ہوں میں
چھپ جاؤں نظر سے ہے وہ ہنگام قریب
وقت اور ہے اب صبح کا تارا ہوں میں

افسوس جوانی کی نہ کچھ غور ہوئی
ہونی تھی جو کیفیت بہر طور ہوئی
دانتوں نے کیا قصد جدا ہونے کا
آنکھوں کی بھی اب ہم سے نظر اور ہوئی

پیری میں عبادت کی کہاں طاقت ہے
سچ پوچھتے ہیں گر تو فقط ہمت ہے
پیروں پر خدا نے کی ہے تخفیف رشیدؔ
دیکھو کہ نماز صبح دو رکعت ہے

طفلی نہ رہی کہ تھی وہ جانے والی
کیا رہتی جوانی تھی مٹانے والی
پیری کو رشیدؔ بس غنیمت سمجھو
اب کوئی نہیں ہے فصل آنے والی

آخری حصہ عمر میں رشید کی اکثر رباعیاں اور بیشتر غزلوں کے مقطع بڑھاپے کی شکایت میں ہوا کرتے تھے اور اس دلدوز عبرت آموز مضمون میں جو رنگینی اور تنوع

پیدا کیا ہے اور وہ بھی اس خوش بیان دور شاعر کا حصہ ہے۔ (گلزار رشید مرتبہ مہذب لکھنوی صفحہ ۸)

پیری میں ہوئے ہیں سفری کی صورت چلتے ہیں نسیم سحری کی صورت
ہم بیٹھتے ہیں غبار خاطر کی طرح اٹھتے ہیں تو درد جگری کی صورت
پیری میں کیا موت کی نشانی پہونچی نزدیک یہ مرگ زندگانی پہونچی
رستے میں بھی ملنے کی توقع نہ رہی ہم اب چلے جب دور جوانی پہونچی

مدحیہ انداز میں رباعی:

بندہ بھی خدائے دو جہاں تک پہونچا ذرہ چمکا کہ آسماں تک پہونچا
بندہ میں علیؑ کا اور علی بندۂ حق دیکھو میرا سلسلہ کہاں تک پہونچا

رشیدؔ نے غزل رباعی کے علاوہ سلام بھی کہے ہیں۔ تعشقؔ کی ایک مشہور غزل ہے ''جس نے اپنے دور میں بہت شہرت حاصل کی'' گلی گلی لوگ اس غزل کے اشعار پڑھتے تھے، اس غزل کا مطلع یہ ہے:

اپنا مزار متصل در بنائیں گے گھر بھی تمہارے گھر کے برابر بنائیں گے
افتادہ رہنے دی تھی زمیں دل کی اس لئے امید تھی کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے

رشیدؔ نے اسی زمین میں سلام کہا ہے جو اپنی خوش گوئی اور سلاست وروانی کی آپ اپنی مثال ہے۔ ان اشعار میں رنگ تغزل نظر آئے گا۔